نظام ازدواج

شادی خانہ آبادی

ہمارے رسوم وقیود   اسلامی کلچر کیا ہے؟

آیۃ اللہ العظمیٰ سرکار سید العلماء
سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن، لکھنؤ

نظام ازدواج
شادی خانہ آبادی
ہمارے رسوم وقیود

آیۃ اللہ العظمیٰ سرکار سید العلماء

علامہ السید علی نقی النقوی طاب ثراہ

پیش کردہ

باقر رضا

انچارج لکھنؤ برانچ وجوائنٹ ٹریزرار امامیہ مشن ہند

ناشر

امامیہ مشن لکھنؤ

مولانا علی نقی روڈ، چوک، لکھنؤ-۳

یو.پی.انڈیا

(مارچ ۲۰۰۷ء)

(قیمت: 20 روپے)

بسمہ سبحانہ

پیش لفظ

سرکار آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ طاب ثراہ کے نہ تو تصانیف اور نہ ہی آپ کی ذات عالی محتاج تعارف ہے۔ جس موضوع پر آپ نے قلم آرائی کی وہ حرف آخر ہو گیا۔

''نظام ازدواج'' یہ رسالہ سرکار کے اُس بیان کا خلاصہ ہے جو آپ نے سید ابن حسین نقوی مرحوم آنریری سکریٹری امامیہ مشن کے فرزند کے عقد کے موقع پر ۱۹۵۷ء کو فرمایا تھا۔ غالباً یہ ہندوستان کا پہلا عقد تھا جس میں شوہر کی طرف سے زوجہ کو وکالت طلاق کا حق بھی دے دیا گیا تھا۔

آج کل کے ماحول سے جو معاشرہ میں اس مسئلہ کو لے کر مشکلات پیش آ رہی ہیں اس رسالہ کی افادیت کو دیکھتے ہوئے پھر ایک بار منظر عام پر لانے کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ افراد ملت اس سے استفادہ کریں اور اس پر عمل پیرا ہو کر ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزاریں۔

''شادی خانہ آبادی'' اور ''ہمارے رسوم و قیود'' یہ رسالے بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان رسالوں میں ہماری شادی کی رسموں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اس پر عمل کر کے افراد قوم اُن فضول اور غیر ضروری رسموں پر اپنی محنت سے کمایا ہوا قیمتی پیسہ

ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں اور اسی پیسے سے دوسرے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کر کے اللہ تعالٰی کی خوشنودی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور قوم کی اقتصادیات کو بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔اس رسالہ میں اسلام کے حقیقی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔

الداعی الی الخیر

باقر رضا

انچارج لکھنؤ برانچ و جوائنٹ ٹریزرار امامیہ مشن ہند

مارچ ۲۰۰۷ء

نظامِ ازدواج

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی سَیِّدِ الاَنبِیَآءِ وَالمُرسَلِینَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِینَ الطَّاھِرِینَ.

قَالَ اللّٰہُ سُبحَانَہٗ وَمِن اٰیَاتِہٖ اَن خَلَقَ لَکُم مِن اَنفُسِکُم اَزوَاجًا لِتَسکُنُوا اِلَیھَا وَجَعَلَ بَینَکُم مَوَدَّۃً وَرَحمَۃً.

یہ نظر خالق میں نظام ازدواجی کی اہمیت ہے کہ جس طرح خلقت آسمان وزمین کو وہ اپنی آیت یعنی قدرت کی نشانی بتاتا ہے جس طرح آفتاب و ماہتاب اور پورے نظام فلکی کو اپنی آیت قرار دیتا ہے جس طرح گھٹاؤں کی آمد و رفت اور ان کی بارشوں کو وہ اپنے آیات میں محسوب کرتا ہے اور خود انسان کی خلقت کو اپنی سب سے بڑی آیت کے طور پر ذکر فرماتا ہے جس کے لئے قرآن مجید میں بکثرت آیات وارد ہوئے ہیں اسی طرح اس آیت قرآنی میں وہ نظام ازدواجی کو بھی اپنی قدرت کی ایک خاص آیت کی حیثیت سے پیش فرمارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تم ہی میں سے ازواج پیدا کئے تاکہ تم سکون و اعتماد کے ساتھ ان کی جانب راغب ہو۔ اور تمہارے درمیان محبت و الفت قرار دی۔ ''پیدا کئے'' کی لفظ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی کا ترک کرنا منشاء تخلیق کے خلاف ہے جو رُہبانیت کے نظریہ پر ضرب کاری ہے۔ اور اس میں لطیف عنوان سے اس مشہور عوامی مثل

کا ماخذ بھی مضمر معلوم ہوتا ہے۔ عوام کہتے ہیں کہ "بر" آسمان سے اترتا ہے۔ مِنْ اَنْفُسِکُمْ تم ہی میں سے اس کی صراحت قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ہے۔ یہ اس بحث کا تصفیہ ہے جو مدتوں عقلائے زمانہ کے درمیان جاری رہی کہ عورت بھی نوع انسانی میں داخل ہے یا نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ تمہارے ہی نفوس کا ایک جزو ہے، اتنا ہی اس کے حقوق کا احساس پیدا کرانے کے لئے کافی ہے لیکن مزید یہ ہے کہ اس دوسری صنف کے لئے ازواج کی لفظ صرف کی۔

سلسلۂ انساب میں جس طرح بھائی کا بس ایک رشتہ ہے جو درمیان میں مکرر ہوتا ہے یعنی یہ اس کا بھائی تو وہ بھی اس کا بھائی ہی ہے۔ کوئی اور نہیں ہے اور جب رشتہ دونوں میں مشترک ہے تو حقوق و فرائض میں بھی یکسانی ہونا چاہئے۔ سلسلۂ اسباب میں اس طرح کی چیز زوجیت ہے یعنی ہماری زبان میں میاں بیوی یا شوہر اور زوجہ دو نام بولے جاتے ہیں مگر قرآنی اصطلاح میں جس طرح مرد اپنی بیوی کے لئے زوج ہے اسی طرح عورت اپنے شوہر کے لئے زوج کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ایک ہی رشتہ ہے جو دونوں طرف سے قائم ہے۔ اور اس زوجیت میں دونوں کی مساوی درجے پر اہمیت مضمر ہے۔ زوج کون ہوتے ہیں وہ دو جن کا باہم اجتماع ایک مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہو، جیسے دروازے کے دو پٹ یا انسان کی دو آنکھیں یا بجلی کے مثبت اور منفی تار۔ ان میں ہر ایک دوسرے کا زوج ہے، اسی طرح خالق نے شوہر اور زوجہ کو زوجین بنایا ہے، اب ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی اہمیت کا انکار کرے۔ اور اس حیثیت سے اُسے کم سمجھے۔ بیشک اپنے صنفی خصوصیات کے لحاظ سے ہر ایک کے اوصاف اپنے اعتبار سے ہونا چاہئیں ہیں جس طرح مثبت تار کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس میں منفی کے اوصاف پیدا

ہوں، اور منفی کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس میں مثبت کی خاصیت پیدا ہو جائے۔ ایسا ہونا حصول نتیجہ کے لئے مضر ہو گا۔ اسی طرح مرد کی ترقی یہ نہیں ہے کہ اس میں نسوانی اوصاف پیدا ہو جائیں، اور عورت کی خوبی یہ نہیں ہو سکتی کہ اس میں مردانے جوہر نمایاں ہو جائیں، بلکہ مرد کا کمال اپنے اوصاف کی ترقی سے، اور عورت کا کمال اپنے جوہر نسوانیت کے ارتقاء سے وابستہ ہے اسی لئے شریعت اسلام نے نماز تک کے احکام میں دونوں کے درمیان فرق رکھا۔ لباس میں فرق، کھڑے ہونے کے انداز میں فرق، سجدے کی شکل میں فرق، بیٹھنے کے طریقے میں فرق، سجدوں کے بعد کھڑے ہونے میں فرق، جہر و اخفات میں فرق، یہ سب کاہے کے لئے ہے اسی لئے کہ اُسے مرد ہونے کا احساس قائم رہے، اور اسے عورت ہونے کا۔

چونکہ یہ دونوں صنفیں قوائے جسمانی میں نمایاں حیثیت سے فرق رکھتی ہیں اور اسی لئے ہماری جدید بول چال میں بھی ان میں سے ایک کو صنف نازک اور صنف لطیف کہا جاتا ہے، لہٰذا فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے فرائض بھی ان کی قوت برداشت کے لحاظ سے ہوں۔ اس لئے تحصیل معاش کی ذمہ داری اسلام نے مرد پر ڈالی اور اسے بیوی کے نان ونفقہ کا ذمہ دار قرار دیا نیز اس کے عزتِ ناموس وعرض کا محافظ بنایا جس میں بسا اوقات حملہ آور قوتوں اور زمانہ کی کشمکشوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس ضرورت سے اس نے ایک محدود دائرے میں عورت کو اس کی مرضی کا پابند بنایا اگر جہاں وہ کہے وہاں وہ رہے ہی نہ اور جہاں وہ منع کرے وہاں جانے میں وہ کوئی رکاوٹ نہ محسوس کرے تو پھر مرد، اس کی عزت وآبرو کی حفاظت ہی کیونکر کر سکتا ہے جو شخص کسی بھی شعبہ کا نگراں ہو اس شعبہ میں یقیناً اس کو نافذ الکلمہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ یہی دائرہ وہ ہے جس میں یہ کہنا صحیح ہے کہ

مرد کی اطاعت زوجہ پر واجب ہے ورنہ دیگر معاملات یہاں تک کہ گھر کے کاروبار اور اپنے ذاتی ضروریات میں مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بطور حکومت عورت سے خادم کی طرح یہ کام لے۔ گھر کا کھانا پکانا یا جھاڑو دینا یا لباس وغیرہ کا درست کرنا ان سب چیزوں کو اصول محبت کے ماتحت انجام پانا چاہیے، اگر ایک گھر میں ماں اور بیٹا یہ دونوں رہتے ہوں تو ظاہر ہے کہ جب بیٹا کسب معاش کے لئے جائے گا تو گھر کا کام ماں انجام دے گی۔ مگر اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ بیٹے کی اطاعت اس شعبہ میں ماں پر فرض ہوگئی اسی طرح جب میاں بیوی ہوں، اور شوہر کسب معاش کے لئے جائے تو گھر کے اندر کے کام زوجہ ہی کو انجام دینا چاہئیں۔ یہ منزلی ضروریات کے ماتحت ایک شائستہ باہمی سمجھوتا ہے۔ اسے اطاعت کہنا غلط ہے۔ بیشک مفاد ازدواجی سے متعلق امور اور حفظ آبرو کے بارے میں جو پابندیاں ہیں وہ اتنی سخت ہیں کہ عورت کسی سیر گاہ کا ذکر کیا اپنے والدین کی عیادت یا شرکت جنازہ کے لئے بھی بغیر شوہر کی مرضی کے نہیں جاسکتی۔ نیز گھر میں کسی کو بلا نہیں سکتی یہاں تک کہ شوہر اگر حقیقی بھائی بلکہ باپ کو بھی روک دے تو اسے بلانا حرام ہوگا۔ لیکن اس کے بالمقابل عورت کے حقوق ازدواجی کے پورا کرنے کی خاطر مرد بھی بالکل آزاد نہیں ہے۔ وہ چار راتوں تک مسلسل بغیر زوجہ کی رضا کے غائب نہیں رہ سکتا۔ کوئی طولانی سفر بغیر اس کی مرضی کے نہیں کرسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ہمارے عرفِ عام میں اطاعت نہیں کہتے، مگر ناموں سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔ واقعہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک کی اطاعت بھی بذات خود دوسرے پر نہیں ہے، بلکہ دونوں ایک بالادست طاقت خالقِ کائنات کی طرف کے قانون کے پابند ہیں۔ جتنا اس نے ضروری جانا اسے پابند بنایا، اور جتنا ضروری سمجھا اسے پابند قرار دیا۔ ان دونوں کو اس کی اطاعت لازم ہے۔ چونکہ زوجین میں ایک طرح

کی ہمسری ضرور پائی جاتی ہے اس لئے شریعت نے ان میں کفویت یعنی برابر کا ہونا ضروری سمجھا ہے، مگر یاد رہے کہ اسلام میں بلندی اور پستی کا تصور حسب نسب کے معیار پر قائم نہیں ہے تو اس شریعت میں برابر ہونے کا بھی نسبی تصور قائم نہیں رکھا گیا، یہاں کفویت اسی معیار کی ہے جس معیار کی بلندی اور پستی ہے یعنی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ ایک درجہ کفویت کا تو وہ ہے جو شوہر اور زوجہ دونوں طرف سے معتبر ہے، اور وہ اسلام ہے شرک کے مقابل میں، جس طرح عورت مسلمان ہو تو اس کی شادی کسی مشرک کے ساتھ کسی طرح کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح مسلمان مرد کی شادی مشرکہ عورت کے ساتھ کسی شکل میں بھی درست نہیں ہے اور اسی طرح غیر مشرک کوئی بھی قسم کا فر کی ہو تو نکاح دائمی میں وہ دونوں طرف سے سدراہ ہے اس کے بعد چونکہ نان ونفقہ کی ذمہ داری اور حفظ عزت وناموس وغیرہ کے لحاظ سے بہر حال ایک طرح کا تفوق مرد کو ہوتا ہی ہے اور اس لئے بھی کہ خلقۃً وہ صنف قوی ہے اور پھر واقعاتی دنیا میں یہ کیوں یقین کیا جائے کہ ہر ایک حقوق کا کلیۃً پابند ہی رہے گا اس لئے عملاً وہ اپنی جسمانی قوت کی بنا پر حدود سے تجاوز بھی کرسکتا ہے اس لئے لڑکی کے لئے شوہر کے انتخاب میں کفو ہونے کا معیار اس سے زیادہ بلند ہوگیا ہے جتنا لڑکے کے لئے زوجہ کی تلاش میں ہے۔

چنانچہ فقہ جعفری میں اہل کتاب عورت کے ساتھ نکاح دائمی تو نہیں ہوسکتا لیکن عقد منقطع جس کی تشریع ہی ضرورت کے خاص موقعوں کے پیش نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے، کتابیہ عورت کے ساتھ جائز ہے جب کہ مشرکہ کے ساتھ کسی صورت سے جائز نہیں۔ وراس کا عکس یعنی لڑکی کا عقد اہل کتاب کے ساتھ کسی شکل میں بھی درست نہیں۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ کفائت کا معیار اُدھر سے زیادہ سخت ہے۔ دوسرا شاہد اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں

کے مختلف فرقوں میں اگر مرد مذہب حق کا پیرو ہے تو زوجہ کے لئے کوئی پابندی لازمی نہیں ہے کہ وہ کس فرقے کی ہو لیکن لڑکی اگر شیعہ ہو تو شوہر کو بھی شیعہ ہونا چاہئے اور اس کے خلاف ہو تو بہت سے علماء کے نزدیک عقد باطل ہے۔ یہ دوسرا شاہد ہے ادھر سے کفائت کے حکم کی شدت کا۔ اسی وجہ سے معصومینؑ کے یہاں بھی زوجہ کے انتخاب میں اتنا سخت معیار پیش نظر نہیں رکھا گیا مگر لڑکی کے لئے شوہر کا انتخاب اتنا سخت مسئلہ تھا کہ امم سابقہ میں ایک معصومہ جو پیدا ہوئی یعنی حضرت مریمؑ تو چونکہ ان کے برابر والا کوئی معصوم اس وقت ایسا نہ تھا تو قدرت نے نظام فطرت کے عام اصول کو توڑ کر بغیر کسی مرد کے انھیں عیسیٰؑ ایسا فرزند عطا فرما دینا ضروری سمجھا مگر شادی ان کی کسی کے ساتھ پسند نہیں کی۔ خالق کو آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ان کے مفاد رسالت کی تکمیل کے مقصد سے عصمت کاملہ کے معیار پر فائز ایک بیٹی عنایت فرمانا ضروری تھی تو اس کے لئے حضرت عبدالمطلبؑ کے وقت سے اہتمام کر کے نورِ واحد کے دو ٹکڑے کئے تا کہ فاطمہؑ کے پہلے رسولؐ کے پاس علیؑ موجود ہوں جن کا رشتہ سیدۂ عالمؑ کے ساتھ ہو سکے۔ اس بنا پر پیغمبرؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ لَوْ لَا فَاطِمَةُ لَمْ يَكُنْ كُفُوًا لِعَلِيٍّ یعنی اگر فاطمہ نہ ہوتی تو علیؑ کا کوئی کفو نہ ہوتا۔ یہ کیونکر فرماتے اگر وہ کفائت جو اسلام میں ضروری ہے نہ ہوتی تو علی ابن ابی طالبؑ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بعد بھی جناب ام البنین وغیرہ سے کیونکر عقد فرماتے بیشک یہ فرمایا کہ لَوْلَا عَلِيٌّ لَمْ يَكُنْ كُفُوًا لِفَاطِمَةَ آدَمُ وَمَنْ دُوْنَهُ. اگر علیؑ نہ ہوتے تو فاطمہؑ کا کوئی کفو آدم سے لے کر اس وقت تک نہ تھا۔ یہ کفویت باعتبار نسب ہرگز نہ تھی۔ ورنہ علیؑ کے جتنے بھائی تھے وہ سب نسبی خصوصیات میں مشترک تھے۔ طالب و عقیل و جعفر سب امیر المومنینؑ کے حقیقی بھائی تھے۔ مختلف البطن بھی نہ تھے کہ ماں کے اعتبار سے

نسب میں فرق ہو سکتا۔ یہ تو ہم بھی غلط ہے کہ طالب اور جعفر وغیرہ چونکہ عمر میں سیدۂ عالمؑ سے بہت زیادہ تھے اس لئے خارج از بحث قرار دیئے گئے اس لئے کہ حدیث کے آخر میں ادمُ وَمَنْ دُوْنَهٗ کا فقرہ بتاتا ہے کہ اس میں عمر کا کیا ذکر صدی اور قرن اور ہزاروں برس کے فرق کا بھی لحاظ نہیں ہے اور پوری عمر دنیا کے افراد بشر پیغمبرؐ کے سامنے ہیں اس صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ یہ کفویت باعتبار جلالت اوصاف اور باعتبار مرتبہ ایمان ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ایسی معزز اور عزیز بیٹی کے عقد میں باپ کا دل کیا کچھ نہیں چاہ سکتا کہ اس عقد کو کس شان اور تزک واحتشام کے ساتھ کیا جائے مگر تاریخ وحدیث کے صفحات اپنے دامن میں عقد کا پورا مرقع لئے ہوئے ہیں کہ وہ کس طرح ہوا۔ اتنا تو ضرور لحاظ رکھا گیا کہ پیغام علیؑ ابن ابی طالبؑ کی زبان سے ہوا اور یہ درحقیقت عورت کی خودداری کا تحفظ قائم کرنا تھا کہ طلبگار صنف قوی یعنی مرد کو ہونا چاہئے اور دوسری صنف کی فرد کو صاحب غرض نہیں ثابت ہونا چاہئے۔ ہاں جب علیؑ ابن ابی طالبؑ حاضر ہوئے اور حجاب کے انداز میں خواستگاری کی تو رسولؐ نے بلا توقف ارشاد فرمایا کہ یہ تو تم اب کہہ رہے ہو اور خداوند عالم عرش پر اس مرحلہ کو طے فرما چکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں داماد کا انتخاب تک رسولؐ کی ذاتی رائے سے نہ ہوتا تھا بلکہ وہ خدا کا منتخب کردہ ہوتا تھا بس اب تکلف ورسوم برطرف، رسولؐ فرماتے ہیں۔ یا علیؑ تمہارے پاس مال دنیا سے کیا ہے؟ عرض کرتے ہیں حضور کو معلوم ہے بس ایک گھوڑا ہے، ایک تلوار ہے اور ایک زرہ، اس کے سوا کچھ نہیں۔ فرمایا گھوڑے اور تلوار کی تمہیں راہ خدا میں جہاد کے لئے ضرورت ہے مگر زرہ درکار نہیں ہے اسے فروخت کردو۔ علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اُسے فروخت کیا جس کی چار سو درہم قیمت ملی۔ یہ ہی حضرت سیدۂ عالمؑ کا مہر قرار پایا۔ اور اس رقم سے جناب رسالت

مآبؒ نے نئے گھر کے لئے سامان خانہ داری خرید فرما کر بیٹی اور داماد کے زندگی گزارنے کا سامان کر دیا اور اس طرح امام المتقینؑ کی شادی سیدۃ نساء العالمینؑ کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچی۔

افسوس ہے کہ ہم لوگوں نے مراسم وقیود میں گھر کر اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر نہیں رکھا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔ قابل مبارک باد ہیں جناب سید ابن حسین صاحب نقوی کہ انھوں نے اپنے یہاں کی سابق شادیوں میں بھی ان خصوصیات کو مدنظر رکھا ہے۔ ایک خاص چیز تو مہر کی ہے جس میں ہمارے یہاں عموماً اتنی زیادتی کر دی جاتی ہے کہ بسا اوقات صحت عقد میں اشکال پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اگر مہر فاطمی کو سامنے رکھا جائے تو یہ صورتیں کبھی نہ پیدا ہوں۔ مگر مہر فاطمی کے لحاظ سے پہلے جو ایک سو سات روپیہ رکھا جاتا تھا وہ اب درست نہیں رہا کیونکہ درہم شرعی چاندی کے ایک مثقال کا ہوتا تھا اب روپیہ میں چاندی گویا ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ حساب غلط ہو گیا ہے جیسا کہ نصاب زکوٰۃ وغیرہ کے حساب بھی جو جناب غفران مآب اعلی اللہ مقامہٗ کے دور سے چل رہے تھے اب درست نہیں رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ حساب لگانا کہ موجودہ روپیہ میں کتنی مقدار بھر چاندی ہے اور اس حساب سے روپیوں کی تعداد مقرر کرنا بہت دشوار ہے اس لئے اب صحیح صورت یہ ہے کہ چاندی کا اتنا وزن مہر میں قرار دیا جائے جو مہر جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے برابر ہو۔ چنانچہ اس عقد میں غالباً پہلی دفعہ یہ مثال قائم کی جا رہی ہے کہ یہاں مہر ایک سو سترہ تولہ چاندی کا مقرر ہوا ہے۔ مہر فاطمی جب قرار دینا ہو تو یہی صورت اب زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بڑی اہم بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں گھریلو تعلقات اکثر ابتری کے درجہ

پہنچ جاتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر زوجہ کو چھوڑ کر چلا گیا اور نان ونفقہ کی کوئی خبر نہیں لیتا، پاکستان بن جانے کے بعد ایسا بہت ہوگیا ہے کہ شوہر پاکستان چلا گیا ہے اور زوجہ یہاں رہ گئی۔ ایسی صورتوں میں لوگ علماء کے پاس آکر فریادیں کرتے ہیں اور زیادہ تر اس بارے میں علماء بے بسی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے لئے میں نے بیس پچیس برس پہلے مدرسۃ الواعظین کے بیانات میں سے ایک بیان میں جو امامیہ مشن لکھنؤ سے کتاب کی صورت میں شائع بھی ہو چکے ہیں اس صورت پر توجہ دلائی تھی کہ شریعت کے عام قوانین کے تحت میں اس مشکل کا حل موجود ہے وہ یہ ہے کہ زوجہ بوقت عقد شوہر سے وکالت طلاق حاصل کرلے اور عقد نکاح اس شرط طلاق کے ساتھ واقع ہو اور یہ شرط متن عقد میں داخل کردی جائے۔ اس صورت کے ساتھ پھر بعض دوسرے علماء بھی متفق ہوگئے۔ چنانچہ اخباروں میں بھی یہ صورت شائع ہو چکی ہے مگر لوگ بروقت عقد، طلاق کے نام کا آنا شگون بد سمجھتے ہیں اور اس صورت پر عمل نہیں کرتے۔ لیکن بعد میں آکر فریادیں کرتے ہیں۔ اس عقد میں اس شرط کو قائم کرکے اور شوہر سے زوجہ کو وکالت طلاق دلوا کر یہ بھی عملی مثال قائم کی جارہی ہے میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم اس عقد کو طرفین کے لئے مبارک و مسعود فرمائے بحق محمد وآلہ الطاہرین علیہم السلام۔

شرائطِ وکالتِ طلاق

اگر شوہر ایک سال تک بلاوجہ شرعی نان ونفقہ نہ دے خواہ اس شہر میں رہ کر خواہ یہاں سے کسی دوسرے مقام پر چلے جانے کی بنا پر یا زوجہ کے ساتھ بدسلوکی کرے جیسے زدوکوب یا ایسی سخت کلامی جو فحش ودشنام میں داخل ہو۔ اور جو غیر شریفانہ صورت رکھتی ہے تو زوجہ کو

حق ہوگا کہ وہ شوہر کی طرف سے وکالتاً خود یا کسی دوسرے کو وکیل بنا کر روبروئے شَاهِدَیْنِ عَادِلَیْنُ صیغہ طلاق جاری کر کے طلاق حاصل کرلے۔"

اس طرح کے شرائط پہلے سے طرفین میں طے ہوجانا چاہئیں یہ شرائط تراضی طرفین سے پہلے معین ہونا چاہئیں تاکہ بروقت عقد اُن کا حوالہ بِالشَّرْطِ الْمَعْلُوم کی لفظ سے دے دیا جائے۔

صیغہائے نکاح

وکیل عورت کہے: اَنْکَحْتُ مُوَکِّلَتِیْ مُوَکِّلَکَ عَلیٰ الْمَهْرِ الْمَعْلُوْمِ بِالشَّرْطِ الْمَعْلُوْمِ.

وکیل مرد کہے: قَبِلْتُ النِّکَاحَ لِمُوَکِّلِیْ عَلَی الْمَهْرِ الْمَعْلُوْمِ بِالشَّرْطِ الْمَعْلُوْمِ.

وکیل عورت کہے: زَوَّجْتُ مُوَکِّلَتِیْ مُوَکِّلَکَ عَلیٰ الْمَهْرِ الْمَعْلُوْمِ بِالشَّرْطِ الْمَعْلُوْمِ.

وکیل مرد کہے: قَبِلْتُ التَّزْوِیْجَ لِمُوَکِّلِیْ عَلَی الْمَهْرِ الْمَعْلُوْمِ بِالشَّرْطِ الْمَعْلُوْمِ.

اسی طرح تمام صیغے جاری کیے جائیں۔

صیغۂ توکیل

بہتر یہ ہے کہ بعد عقد ایک شخص ناکح سے صیغۂ توکیل کے اجراء کی اجازت لے لے اور دوسرا شخص عورت کی طرف سے قبول توکیل کا وکیل ہوجائے۔ پھر

وکیل مرد کہے: وَكَّلْتُ فُلَانَةً فِي الطَّلَاقِ عَنِّي بِنَفْسِهَا اَوْ بِوَكِيلِهَا بِالشَّرْطِ الْمَعْلُوْمِ.

وکیل عورت کہے: قَبِلْتُ التَّوْكِيلَ لِمُوَكِّلَتِي بِالشَّرْطِ الْمَعْلُوْمِ.

شادی خانہ آبادی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ اِقۡرَارًا بِنِعۡمَتِہٖ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِخۡلَاصًا لِوَحۡدَانِیَّتِہٖ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ سَیِّدِ بَرِیَّتِہٖ وَعَلَی الۡاَصۡفِیَاءِ مِنۡ عِتۡرَتِہٖ (اَمَّا بَعۡدُ) فَقَدۡ کَانَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ عَلَی الۡاَنَامِ اَنۡ اَغۡنَاھُمۡ بِالۡحَلَالِ عَنِ الۡحَرَامِ فَقَالَ وَقَوۡلُہُ الۡحَقُّ وَاَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَالصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَاِمَائِکُمۡ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَاءَ یُغۡنِھِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ۔

یہ خطبہ وہی ہے جس کو آپ برابر عقد نکاح میں سنا کرتے ہیں۔ ارشاد حضرت احدیت ہے کہ جو تم میں سے مرد ایسے ہوں جن کے عورتیں نہ موجود ہوں اور جو تم میں سے عورتیں ایسی ہوں جن کے مرد نہ ہوں ان کی شادی کرواگر وہ فقیر ہوں گے تو خدا اپنے فضل سے غنی کردے گا۔ خدا کے یہاں بڑی وسعت ہے اور وہ ہر ایک کے مقدار استحقاق کو جاننے والا ہے۔

اس میں ہدایت کی جارہی ہے اور حکم دیا جارہا ہے نظام ازدواجی کے قائم رکھنے کا جس پر نوع بشری کی بقا دنیا میں موقوف ہے کیونکہ اسلام دنیا میں انسانی آبادی کو بڑھانے اور ترقی دینے کے لئے آیا تھا وہ ان صورتوں کو پسند نہیں کرتا جو اس دنیا کو برباد کردینے کی باعث ہیں بلکہ وہ دنیوی ضرورتوں کو بھی قواعد وقوانین کے شکنجہ میں گرفتار کرکے مذہبی فرض کی حیثیت دے دیتا ہے۔

عقد کے صیغے

یہ اسلام کا وہ حکیمانہ رویّہ ہے جس نے خالص مادّی افعال میں بھی روحانیت کا پہلو پیدا کر دیا ہے اور احساس فرائض کا جوہر ودیعت کیا ہے۔ وہ چیزیں جو بظاہر تعیّش نفس کے لئے کی جاتی ہیں اور طبیعت کے حظ کے لئے ہوتی ہیں ان میں ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ انسان ایسے اوقات میں بھی اپنے مالک کی یاد سے غافل نہیں ہوتا اور اسے اپنی ''بندگی'' کا تصور رہتا ہے جو احساس فرائض کا خاص جوہر ہے۔

یہی رمز ہے جو عقد کے صیغوں میں مضمر ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ ان صیغوں میں کوئی اس طرح کی تاثیر ہے جیسی منتروں میں ہوتی ہے یا ویسی خاصیت کہ جیسی دواؤں میں ہے۔ بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ سے انسان کے نفس میں ایک احساس پیدا کیا ہے پابندی فرائض اور اپنے مالک کی اطاعت کا۔ دیکھئے تو کہ جس وقت انسانی خواہشیں ہجوم کئے ہوئے ہوتی ہیں تو انسان گویا اندھا ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی اگر اس وقت فوراً اس کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جب تک یہ الفاظ نہ جاری کئے جائیں ہمارے لئے کوئی صورت جواز کی نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسے وقت بھی اپنے خدا کو نہیں بھولا۔ لباس میں، کھانے پینے میں اور خاص ضروریات زندگی میں شرع کی طرف سے بہت سی پابندیاں اسی اصول کی بناء پر عائد کی گئی ہیں۔

انسان نکاح کرتا ہے اپنی ذات کے تقاضائے خواہش سے مگر خدا کے احکام بھی یاد رکھتا ہے اس کی وجہ سے ایک طرف اپنی خواہشیں پوری ہوتی ہیں دوسری جانب عبادت کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

یہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم تھی جیسا کہ انجیل میں ہے کہ ''خدا کی بادشاہت میں داخل

نہیں ہوگا جس نے شادی کرلی‘‘۔ لیکن رسالت مآب کی تعلیم یہ ہے کہ "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ." ’’نکاح میری سنت میں داخل ہے جو میری سنت سے روگردانی کرے وہ مجھ سے تعلق نہیں رکھتا‘‘۔ مگر روگردانی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان قابل اعتراض سمجھے۔ اگر کسی مصلحت کی وجہ سے کوئی شخص نکاح نہ کرے تو وہ اس میں داخل نہیں ہے۔

اور تاکید فرمائی تَنَاكَحُوا وَتَنَاسَلُوا تَكْثُرُوا فَاِنِّيْ اُبَاهِيْ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَوْ بِالسِّقْطِ.

’’شادی کرو اور نسل انسانی میں اضافہ کرو۔ میں تمہاری کثرت تعداد پر فخر کروں گا یوم قیامت‘‘۔

شادی میں منہیّات کا ارتکاب

لیکن اگر انسان نے عقد نکاح یا اور کوئی تقریب اس طرح کی کہ خدا کے بھلانے کا ذریعہ قرار پا گیا تو مقصد اسلام کا نہیں حاصل ہوگا۔ دنیا میں شادی کو حقیقۃً ایک نعمت سمجھنا چاہئے۔

یہ وقت آیا کہ اولاد ہوئی، منتیں مانی جاتی ہیں۔ دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ کاہے کے لئے؟ وہ دن آئے کہ بچہ جوان ہو اور شادی کا وقت آئے۔ خدا کے فضل سے بچہ جوان ہوا۔ ماں باپ کے دل سے پوچھئے کہ ان کو اس کی شادی کی کتنی تمنا ہے اور کتنی حسرت وہ ماں باپ جو دنیوی زندگی سے مصائب وآلام کی وجہ سے عاجز ہوں ان سے بھی اگر پوچھئے کہ دنیا میں رہنے کو جی چاہتا ہے؟ تو وہ بھی کہیں گے کہ اس بچہ کا سہرا دیکھ لیں۔ خصوصاً لڑکی کی شادی میں تاخیر ہو تو ماں باپ کو بڑی فکر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شادی کے

وقت وہ روتے ہیں اس لئے کہ ان کی لڑکی اُن سے چھٹ جائے گی مگر جب دیر ہوتی ہے تو اضطراب ہوتا ہے کہ کہیں جلدی سے شادی ہو جائے اس کے لئے بہت دعائیں کی جاتی ہیں۔ بعض وہ جو شرعی ہیں اور بعض وہ جو بالکل بیہودہ ہیں۔

مثلاً بارہ بجے رات کو کوٹھے پر جانا، کسی طرح سے آواز کا بلند کرنا، شہدرہ والی مسجد میں لڑکیوں کا بھیجنا، جن کی زبان سے شادی کا نام نکلنا معیوب سمجھا جائے۔ مگر اس رسم کے ادا کرنے کے لئے وہ لڑکی بھیجی جائے اور خاص رسم انجام دی جائے۔ میں نے سنا ہے کہ اس ذیل میں بہت افسوس ناک واقعات بھی ہو جاتے ہیں۔ میرا یہ مطلب ہے کہ شادی کتنی تمناؤں اور آرزوؤں سے ہوتی ہے پھر جب خدا نے اپنے لطف و کرم سے یہ دن دکھلایا اور ایسے اسباب مہیا کئے ایسی صورتیں پیدا کیں جن کی وجہ سے یہ دن آیا تو اس سرکش انسان کو یہ ضد ہے کہ تو سہی جو تیری اس نعمت ہی کو تیرے گناہ کا بہانا قرار دوں۔

راتیں گذر رہی ہیں، گانے والے اور گانے والیاں (یہ گانے والے، مذکر کے لئے نہیں، وہ گانے والے بھی مونث ہیں) یعنی گانے والے طائفے اور گانے والی ڈومنیاں، وہ جمع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ ہوتا ہے جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ کس بات پر؟ یہ اس لئے کہ خدا نے یہ دن دکھایا کہ لڑکے یا لڑکی کی شادی ہوئی۔ قرآن میں ارشاد ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ''اگر تم ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو ہم اور زیادہ نعمتیں عطا کریں گے اور اگر کفران نعمت کرو گے تو سزا بھی سخت دیں گے۔'' مگر افسوس ہمارے یہاں بہت سے افراد خدا کی نعمت پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس کی معصیت کرتے ہیں۔

بچہ پیدا ہوا ہے، ولادت ہوئی لڑکے یا لڑکی کی۔ رتجگا ہوگا، اس میں بھی وہ کچھ

ہوگا جو خدا کی ناراضگی کا سبب ہو۔اس کا نتیجہ ہے کہ نعمتیں سلب ہوتی جاتی ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ برکت نہیں ہوتی علمائے ملت نے منع کیا کہ رقص وسرود نا جائز ہے۔ بہت سے لوگوں نے نہیں مانا۔ مگر جب دولت نہ رہی تب علماء کے فتاوے کو بہانہ قرار دیتے ہیں اپنی بے سروسامانی کا۔اب ''عصمت بی بی بے چادری'' علماء قُرْبَةً اِلَى اللّٰهِ نکاح پڑھا بھی جائیں گے لیکن طائفے نہ آئیں گے بغیر روپئے کے لئے ہوئے جب روپیہ نہیں ہے تو طائفہ بھی رخصت۔اب جو آپ سے پوچھا گیا تو آپ فرماتے ہیں علماء خلاف ہیں اس لئے ہم نے اس رسم کو ملتوی کیا۔ ہم تو خوش ہیں کہ خیر اسی بہانے سے سہی خدا تو یاد آیا۔ یہ درحقیقت انسان کا نعمت کو نہ پہچاننا اور اپنے فرائض زندگی کو نہ خیال رکھنا ہے۔

رسموں کی غیر ضروری پابندی

وہ رسمیں جو باپ دادا کے وقت سے چلی آتی ہیں۔ وہ اس قدر ضروری سمجھ لی گئی ہیں کہ نکاح بغیر ان کے گویا صحیح ہی نہیں ہوسکتا۔رسموں کی کوئی تعیین نہیں ہوسکتی۔ وہ ملکوں میں نہیں شہروں میں بدلتی ہیں۔شہروں میں نہیں گھروں میں بدلتی ہیں۔ ہر گھر کی کچھ خاص رسمیں معین ہوگئی ہیں۔

غیر مشروع رسمیں

ان میں سے بعض رسمیں خلاف شرع ہیں جس طرح سے بعض گھروں میں یہ رسم ہے کہ مہندی جو دولہا کی بہنیں ہوتی ہیں وہ لگاتی ہیں۔اگر وہ بہنیں حقیقی [illegible] ہیں تب تو جائز ہے لیکن حقیقی اور غیر حقیقی کا تو سوال ہی نہیں ہے کیونکہ آپ کے یہاں تو بھائی بہن چچا ماموں وغیرہ کا رشتہ اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ شرع کی نگاہ نہیں جاسکتی۔ کسی سے پوچھئے کہ یہ آپ کے بھائی ہیں کہیں گے کہ جی ہاں ہوتے ہیں اسی طرح بہت سی بہنیں وہ ہیں کہ جو

بہن ہیں نہیں مگر بہن ہوتی ہیں یہ بھی مہندی کے موقع پر شریک ہوتی ہیں۔ ان کا ہاتھ جسم میں لگنا نا جائز ہے۔

اس کے بعد بہت سے گھرانوں میں یہ رسم ہے کہ جب دولہا کا عقد ہو جاتا ہے تو وہ اندر سلام کرنے زنانہ میں جاتا ہے تو اس وقت پردہ کا کوئی خاص سوال نہیں ہوتا۔ عقد ہو گیا نا! کوئی پردہ کا سوال نہیں۔ اس وقت سب محرم ہیں حالانکہ عقد ایک ہی کے ساتھ ہوا ہے۔ ایسی ہی ممکن ہے اور بھی رسمیں ہوں جو شرعاً جائز نہیں ہیں۔

مسرفانہ فضول رسمیں

وہ چیزیں جو خاص حیثیت سے ناجائز نہیں کہی جاسکتیں۔ اسراف بیجا میں داخل ہو کر زندگی کی تباہی کے اسباب مہیا کرتی ہیں۔ انھیں اس طرح سے لوازم زندگی کی تباہی کے اسباب مہیا کرتی ہیں۔ انھیں اس طرح سے لوازم زندگی میں قرار دے دیا گیا ہے کہ لڑکیاں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ عقد نہیں کیا جاتا اس لئے کہ اتنا روپیہ نہیں کہ تمام رسمیں انجام پاسکیں۔

منگنی

ابتدا ہوتی ہے منگنی سے۔ بیشک لڑکے والوں کا حق ہے لڑکی والوں سے خطبہ کریں یعنی خواستگاری کریں۔ اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ لڑکے کی واقعی حالات جو ہوں جو واقعی اس کی آمدنی ہو۔ جو واقعی اس کے توقعات ہوں وہ پیش کئے جائیں لڑکی والوں کے سامنے، لیکن عام طور سے اس وقت غلط توقعات قائم کئے جاتے ہیں۔ یہ نظام زندگی کے لئے مضر ہے اگر اسی وقت سے صحیح حالات معلوم ہوں تو بعد میں برے نتائج کا اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کچھ غلط حالات بیان کر کے اور یا توقعات قائم کر کے عقد

کر دیا جائے جو بعد میں غلط ثابت ہوں تو اس کے لئے بعد میں بہت افسوسناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

بعض مقامات پر لڑکے والے اس کے متمنی ہوتے ہیں کہ مطلوبہ لڑکی کے ساتھ جہیز اور سرمایہ کے حصول کا اطمینان کرلیں اور یہ دریافت کریں کہ لڑکی کو ملے گا کیا؟ میری رائے میں یہ انتہائی پست نگاہی ہے۔ لڑکی کا نان ونفقہ تو شوہر کے ذمہ ہے اس لئے لڑکی والوں کو ضرورت ہے کہ وہ لڑکے کی مالی حالت کی طرف سے اطمینان حاصل کریں مگر لڑکی کے سرمایہ سے شوہر کو کیا غرض؟ کیا وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی عورت کے مال و دولت سے بسر ہو؟ یہ انتہائی بے غیرتی کی بات ہے۔

مانجھا

عقد کے پہلے مانجھا ہے۔ اس میں دولہا پر اتنی مصیبت نہیں پڑتی لیکن دولہن ایک کوٹھری میں مقید کر کے بٹھادی جاتی ہے۔ زرد رنگ کے رنگے ہوئے کپڑے پہنا دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ممانعت ہے کہ وہ باہر نہ نکلے۔ اسی کوٹھری میں رہنا چاہئے۔

اب ظاہر ہے کہ حوادث زمانہ انسان کے خیالات کے پابند نہیں ہوتے۔ اکثر اتفاق ایسا ہوتا ہے کہ جو دن تاریخ مقرر تھا وہ ٹل گیا۔ اب ایک مہینہ کے بعد عقد ہوگا۔ مگر جب تک عقد نہ ہو وہ بے چاری اس کوٹھری میں رہے گی۔ روز بٹنا ملا جائے گا، روز تیل ملا جائے گا یہاں تک کہ عقد کی تاریخ آئے۔ اس دوران میں اگر شرعی ضروریات کی وجہ سے اس کو طہارت کرنا بھی واجب ہو تو ہرگز نہیں۔ اسے نہانا ممنوع ہے۔ حکم شرع اس معاملہ میں کچھ نہیں سمجھا جائے گا، یہ بالکل ناجائز ہے اور اگر حکم شرع سے تصادم نہیں ہے تب بھی وہ فضول اور تکلیف دہ چیز ہے۔

سانچق

بعض گھروں میں سانچق اور بَری ہوتی ہے۔ اس کی کیا صورت ہے؟ مٹکیاں، مٹکیوں میں دہی اور مچھلیاں۔ یہ سب وہاں بھیجا جائے گا اس کے ساتھ جوڑے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے لیکن جوڑے وہ ہونا چاہئیں جو لڑکی کے لئے آئندہ کام آئیں لیکن اس میں کچھ تو نمائش خالی ہے دوسرے یہ کہ اگر اتنی استطاعت نہیں کہ یہ سب انجام پا سکے تو مانگے کے جوڑے لئے جاتے ہیں کرایہ پر جوڑے لئے جاتے ہیں۔ چوتھی کا جوڑا بڑا بھاری ہونا چاہئے۔ وہ چوتھی کا جوڑا اکثر مانگے یا کرایہ کا لیا جاتا ہے۔ اب آپ بتلایئے کہ عزت کے لئے کیا تھا یا ذلت کے لئے۔ ظاہر ہے کہ عزت کے لئے تو جب وہ چیزیں جس کے یہاں سے آئی تھیں وہاں کل چلی گئیں تو عزت کہاں رہی۔ جو کچھ بھی ممکن ہو آپ سے وہ دے دیجئے اس میں خواہ مخواہ نمائش سے کوئی فائدہ نہیں۔

منڈھا

اس کے بعد منڈھا ہوتا ہے۔ یہ شالباف سے منڈھا جاتا ہے۔ اس کے نیچے ایک جگہ پر دولہن بٹھائی جاتی ہے اور معلوم نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔

بارات

اس کے بعد بارات یعنی دولہا والے دولہن کے یہاں جائیں اور وہاں عقد ہو۔ یہ بالکل درست ہے، جناب خدیجہ کا عقد بھی یوں ہی ہوا تھا۔

رسالت مآبؐ مع جناب حمزہ و جناب ابوطالبؑ اور بنی ہاشم کے جناب خدیجہ کے یہاں گئے تھے۔ جناب معصومہ کا عقد اصل تو عرش پر ہوا تھا اور دنیا میں مسجد میں ہوا۔

امیر المومنینؑ تشریف لے گئے تھے۔

یہ بارات قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن دولہا گھوڑے پر ضرور بیٹھے، چاہے گھوڑے پر بیٹھنا نہ آتا ہو، اسی طرح کی بعض اور فضول رسمیں جن کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔

ہندو روایات کا اثر

جب ہم ان رسموں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ہندوؤں کے یہاں جب زمانۂ جاہلیت تھا تو لڑکیوں کو مال غنیمت کی طرح سے لے جایا کرتے تھے وہ دور گذر گیا لیکن اس کی یادگاریں بطور رسموں کے رہ گئیں۔ چنانچہ اس کا اثر تمام رسموں میں ملاحظہ کر لیجئے جس وقت سے بارات آتی ہے جب تک کہ عقد نہ ہو جائے اس وقت تک ان کے ساتھ مخالفانہ برتاؤ ہوتا ہے۔ وہ پانی تک نہیں پا سکتے کیونکہ ابھی تو لڑائی ہے جب لڑائی فتح ہو جائے گی تب سب ایک ہو جائیں گے۔ بعض گھرانوں میں تلواروں کا سایہ بھی سر پر کیا جاتا ہے۔

پھر چوتھی کی رسم۔ اس میں ایک فریق ادھر ہوتا ہے اور ایک فریق اُدھر۔ بیچ میں ہوتے ہیں مختلف پھل، ایک فریق دوسرے پر حملہ کرتا ہے اور پھلوں سے ضرب لگاتا ہے چاہے کسی کے چوٹ ہی لگ جائے مگر کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ یہ یادگار ہے اس رسم کی اس زمانہ میں پھل لوہے کے ہوتے تھے اب کھانے کے ہوتے ہیں۔ یہ درحقیقت سب ہندوؤں کی رسمیں ہیں جو مسلمانوں میں آگئیں اس کا سبب یہ ہے کہ اکبر نے اپنے زمانہ میں مختلف اقوام میں شادیاں کیں۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کے یہاں بھی شادیاں کیں اور ان کے رواسم کو برتا۔ کیونکہ وہ ایک بہت بڑا بادشاہ تھا۔ مذہب جدید کو بھی قائم کرنا چاہتا

تھا۔ اللہ اکبر میں جل جلالہ اپنے نام کی مناسبت سے تکبیروں میں اذان کے داخل کر دیا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ رسمیں پائی جاتی ہیں۔ عراق جایئے، ایران جایئے، مصر جایئے لیکن یہ مراسم نہیں ہیں جو آپ کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

لباس

آپ اپنے یہاں ملاحظہ فرمایئے۔ دولہا کا لباس جو ہوتا ہے وہ علیحدہ ہوتا ہے ان عام کپڑوں سے جو مسلمانوں میں عموماً رائج ہیں۔ فی الحقیقت وہ تصویر ہوتی ہے اس لباس کی جو ہندوؤں میں رائج ہے۔ پھر حریر محض ہونا اس کا جز ہے حالانکہ ریشم کا پہننا مردوں کے لئے ناجائز ہے اس میں لچکا، پٹھا وغیرہ بھی ہوتا ہے اس سے بھی مردوں میں کوئی حسن نہیں پیدا ہوتا۔

عورتوں کا بہانہ

بعض لوگ جو خود تعلیم یافتہ یا صاحب علم ہیں افسوس ہے کہ ان معاملات میں وہ بھی آ کر کمزور ہو جاتے ہیں۔ جب آپ ان سے پوچھئے کہ یہ کیا ہے تو کہیں گے کہ عورتوں سے بس نہیں چلتا۔ ان سے مجبور ہیں لیکن یہ جواب بالکل غلط۔

پہلے تو میں کہوں گا کہ عورتوں کی ذہنیت کی تشکیل کی ذمہ داری خود مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ابتدا ہی سے مرد اس طرح کی تعلیم اور ہدایت کرتے رہیں تو شادی کے موقع پر وہ بضد ہی نہ ہوں گی۔ رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ''تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا حاکم ہے اور ہر حاکم اپنی رعیت کے لئے جوابدہ ہے کہ اس نے تربیت کیسی کی۔

پھر اگر آپ نے ان کے خیالات کی اس طرح سے اصلاح نہ کی تب بھی آپ اس امر میں ان کے تابع فرمان کیوں بن جائیں کہ وہ جو کہیں آپ کریں۔ حالانکہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ''مرد ذمہ دار ہیں عورتوں کے۔''

لیکن اس امر میں آپ نے ان کو حاکم قرار دے دیا ہے۔ آپ کے یہاں اَلنِّسَآءُ قَوَّامَاتٌ عَلَى الرِّجَالِ ''عورتیں مردوں کی حاکم ہیں۔'' اگر معلوم ہو جائے کہ آپ ایسا نہ کریں گے تو ہرگز وہ ضد نہ کریں مگر آپ اپنے ذاتی معاملات میں تو حد سے آگے بڑھتے ہیں۔ کسی وقت کھانا وقت پر تیار نہ ہوا تو تیوریوں پر بل آگیا۔ کون کہتا ہے کہ شرع نے کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی عورتوں پر عائد کی ہے۔ کون کہتا ہے کہ شرع نے کپڑے سینے کی ذمہ داری بھی عورتوں پر عائد کی ہے۔ یہ تو مخالفین خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں اسلام پر کہ عورت کو کچھ حقوق نہیں دیئے۔ ورنہ اسلام نے تو عورت کو اتنے حقوق دیئے ہیں جتنے کسی مذہب نے نہیں دیئے۔ عملی حیثیت سے اسلام ہی نے عورت کو شریک حیات قرار دیا ہے۔ حقیقۃً یہ فرائض تو وہ ہیں جو اصول محبت کے تحت میں انجام پانا چاہئیں۔ یہ تو اتحاد عمل کا طریقہ ہے کہ تقسیم کار ہو۔ فرض کیجئے کہ گھر میں ایک ماں اور ایک بیٹا ہے تو کیا ہوگا؟ بیٹا اگر ملازمت پر جائے گا تو ماں کھانا پکائے گی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ماں پر اطاعت بیٹے کی واجب ہوگئی۔ یہ تو اخلاقاً فرض ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک گھر میں بھائی بہن ہیں تو وہ کیا کریں گے؟ بھائی جس وقت ملازمت پر جائے گا تو بہن کھانا تیار کرے گی۔ اسی طرح اگر شوہر اور زوجہ ہے تو زوجہ گھر کا خیال رکھے گی۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ریاست قائم ہوگئی۔ عورت خدمتگار نہیں ہے۔ آج کل دنیا والے پردہ پر جو اعتراض

کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ اسلام نے عورت کو سرمایہ دار قرار دیا ہے اور مرد کو مزدور بنایا ہے۔ اس پر نظام زندگی کی حیثیت سے گھر کا کاروبار عائد ہوتا ہے۔ آپ ان باتوں میں عورت سے اطاعت چاہتے ہیں جن میں خدا نے اس پر اطاعت کو واجب نہیں کیا لیکن جب ایسے امور درپیش ہو جاتے ہیں جو شادی کی رسموں سے متعلق ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے بڑھ کر عورت کا کوئی مطیع ہی نہیں ہے۔

شوہر و زوجہ کے باہمی حقوق

یاد رکھنا چاہئے کہ مرد کی اطاعت عورت پر اس طرح کی نہیں ہے جس طرح باپ کی اولاد پر۔ باپ کی اطاعت کا ایسا درجہ ہے کہ اولاد کوئی بات کر ہی نہیں سکتی۔ اور ہر بات قابل اطاعت ہے جب تک کہ احکام خدا سے نہ ٹکرائے۔ یہاں تک کہ کوئی مستحب چیز ہو اور وہ منع کرے تو صحیح نہ ہوگا۔ زیارت سید الشہداءؑ نہیں صحیح ہے اگر باپ منع کر دے، شوہر کی اطاعت زوجہ پر ان چیزوں میں ہے جو حقوق شوہر و زوجہ سے وابستہ ہیں مثلاً گھر سے قدم نکالنا عورت کے لئے جائز نہیں۔ یہاں تک کہ باپ کی عیادت کو نہیں جاسکتی۔ باپ مر جائے اس کی تجہیز و تکفین میں نہیں جاسکتی۔ ان معاملات میں شوہر کو حق دیا ہے لیکن زندگی کے معاملات میں شوہر کو مجبور کرنے کا زوجہ کو کوئی حق نہیں ہے اس کے علاوہ حکم خدا کے خلاف اطاعت جائز نہیں ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے شوہر اپنے خاص عزیزوں کے سامنے کرنے پر زور دیتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ بالکل ناجائز ہے اور عورت پر اس حکم میں اطاعت جائز نہیں ہے اس میں شوہر کا کہنا مانے۔ اگر سامنے ہوگی تو یہ بھی گنہگار ہوگی اور وہ بھی گنہگار رہوگا۔

عزیزوں کے سامنے ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے آپ کے یہاں جو پردہ اٹھ رہا ہے میں سچ کہتا ہوں کہ وہ بحیثیت فرض مذہبی انجام ہی نہیں دیا گیا۔ اگر فرض مذہبی کی حیثیت میں ہوتا تو آج یہ تمام لوگ جن کو شرع نے نامحرم قرار دیا ہے نامحرم ہوتے اور جن کو محرم قرار دیا ہے وہ محرم ہوتے۔ آپ نے تو خود تعیین کر لی ہے جس کی وجہ سے خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

شیش محل میں ایک صاحب نے کہا تھا کہ کیا پردہ دار گھرانوں میں اس طرح کے حالات نہیں پیش آتے جنھیں آپ بے پردگی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور پیش آتے ہیں لیکن وہ بھی بے پردگی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یعنی اکثر ان ہی عزیزوں کے ہاتھوں جنھیں شرع نے نامحرم قرار دیا ہے مگر آپ انھیں محرم بنا دیتے ہیں۔

مہر

شادی میں مہر ایک ضروری چیز ہے۔ مگر کیا اتنا مہر کہ جس کا تصور بھی پورے طور پر نہیں ہو سکتا۔ یہ لکھنؤ میں سب سے زیادہ وبا پائی جاتی ہے۔ میں نے باہر دیکھا کہ یہ مصیبت اتنی زیادہ نہیں ہے۔ کیا بات؟ یہاں ایک زمانہ تھا سلطنت تھی، اس وقت ہر شخص گویا بادشاہ تھا۔ اس لئے ان کی نظر میں ستر ہزار روپے ایسے تھے جیسے ہمارے لئے ستر ہزار پیسے۔ بلکہ ہم میں اکثر ایسے بھی نہیں جن کے پاس ستر ہزار پیسے ہوں۔ چہ جائیکہ ستّر ہزار روپئے، چہ جائیکہ ستّر ہزار سرخ سلطانی ایسی چیز جو کبھی دیکھی نہیں اسے آپ بطور قرض کے اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں یہ کس خدا نے کہا ہے؟

یہ مہر کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ قرضہ ہے جو آپ کے ذمہ پر آتا ہے۔ اس کا دینا اسی طرح ضروری ہے جس طرح سے تمام قرضوں کا دینا ضروری ہے۔ نتیجہ اس

طرز عمل کا یہ ہوا کہ گورنمنٹ کی طرف حسب حیثیت کا اصول مقرر ہو گیا۔

اب بتائیے کہ شرع کا مقررہ اصول کس نے پامال کیا؟ خود ہمارے طرز عمل نے۔ اگر ہم مہر اسی اصول پر مقرر کرتے جو عقل میں آسکے تو ہم باعث نہ ہوتے اس اصول کے پامال ہونے کا۔ لیکن ہم نے حکم شرع کا استعمال اس طرح کیا کہ وہ ایک مہمل چیز ہو گئی آپ کا مہر کوئی چیز نہیں رہا۔ میں تو کہتا ہوں کہ سب سے پہلے تو وہ ہونا چاہئے جو سیدۂ عالم کا مہر تھا (مجھے خوشی ہے کہ اس وقت جو عقد ہو رہا ہے اس میں وہی مہر ہوگا جو سیدۂ عالم کا تھا) لیکن اگر آپ بڑھانا ہی چاہتے ہیں تو اتنا بڑھائیے کہ عمر بھر میں مشکل سے ادا ہو سکے۔ لیکن اتنا جس کی چوتھائی کیا دسواں حصہ بھی وہ ادا نہ کر سکے۔ اور پھر لطف یہ کہ اتنے مہر میں معاملت ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں پچاس ہزار تو وہ کہتے ہیں تیس ہزار۔ یہ کیا ہے؟ یہ تکلف کرنا بھی ایک قانون قرار دیا گیا ہے۔ مہر اتنا ہونا چاہئے کہ عقلاً یہ ادا کر سکے۔ ایسی چیزیں جو عادت کے خلاف ہوں لیکن خدا کی قدرت میں داخل ہوں تو ان کو معجزہ کہا جاتا ہے مگر معجزہ ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اگر ہر شخص کے لئے ممکن ہو تو معجزہ معجزہ ہی نہ رہے۔ معجزہ کی توقع ہر شخص کو نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے اس طرح کا مہر قرار دینا جو عالم تصور وخیال میں بھی نہ آئے اس کا نتیجہ ہے کہ شوہر کے دل میں خیال ہوگا کہ یہ مہمل بات ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عقد کو کوئی چیز نہیں سمجھتا۔ اور اگر وہ ایسا سمجھے تو حقیقتہً ایجاب وقبول ہی نہیں ہوا۔

جس چیز کا نام ہے قصدِ انشاء جو حقیقت ایجاب وقبول ہے وہ نہیں حاصل ہوگا تو عقد باطل ہوگا۔ ضرورت ہے اس بات کی کہ ان تمام چیزوں میں اُسوۂ خاندان رسالتؑ کا پاس رکھا جائے۔ رسولؐ کی ایک اکلوتی لڑکی تھی۔ کیا رسولؐ کے دل میں تمنائیں نہ

ہوں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت سیدہ کی کتنی عزت کرتے تھے۔ کوئی باپ اپنی لڑکی کی تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہوگا لیکن رسالت مآبؐ سیدۂ عالم کی اتنی عزت کرتے تھے کہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اتنی عزت کرتے تھے کہ ہاتھوں کا بوسہ لیتے تھے، اتنی محبت کرتے تھے کہ جب کسی غزوہ پر جاتے تھے تو سب کے بعد سیدۂ عالم سے مل کر جاتے تھے اور جب واپس آتے تھے تو سب سے پہلے سیدۂ عالم سے ملتے تھے۔ تو کیا رسول اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جتنا ہم اپنی لڑکیوں کے لئے کر لیتے ہیں۔ اگر رسول کو اپنی صاحبزادی کے لئے روپئے کی ضرورت ہوتی تو میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمان روپے کا ڈھیر لگا دیتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے یہ پیش کیا تھا کہ ہماری تبلیغ میں آپ نے بڑی کوشش کی ہے آپ کوئی حق مقرر کیجئے، تو یہ آیت نازل ہوئی کہ ''میں کوئی حق نہیں قرار دیتا سوائے اپنے قرابت داروں کی محبت کے۔''

عبد الرحمن بن عوف کی حیثیت ایسی تھی جن کے کئی سو مویشی چرتے تھے۔ اسی طرح سے اور بہت سے اصحاب رسول ایسے تھے تو اگر رسولؐ اشارۃً کہہ دیتے تو مسلمان اتنا روپیہ فراہم نہ کر دیتے آپ کے سامنے؟ مگر وہاں تو مطلب ہی یہ نہ تھا۔ یہ میں نے تمام اسباب دنیا کے اعتبار سے کہا ہے ورنہ آپ کا عقیدہ تو یہ ہے کہ رسولؐ چاہتے تو سنگریزے لعل و گہر بن جاتے مگر یہ عقیدہ سے متعلق ہے عام نظام دنیا کے لحاظ سے نہیں کیونکہ رسالت مآبؐ اور ائمہ اپنے متعارف نظام زندگی میں عام اسباب کے لحاظ سے عمل کرتے تھے پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ آپ نے کس طرح شادی کی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے اپنی اس عزیز ترین لڑکی کا عقد اپنے عزیز ترین بھائی کے ساتھ جس صورت سے کیا وہ اس دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔

رسالت مآبؐ نے جہیز بھی دیا تھا۔ مگر کیا جہیز تھا (آپ بھی اپنے حسب حیثیت دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر اس کے لئے ضرورت نہیں ہے کہ لڑکیوں کو بٹھا رکھا جائے) سامان کیا دیا تھا؟ جو چیزیں لڑکی اور داماد کے لئے کارآمد سمجھتے تھے۔ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ بالکل اسی طرح چکی ضرور دیجئے، چرخہ ضرور دیجئے، میں تو یہ کہتا ہوں کہ ضروریات زندگی کے لحاظ سے جو کچھ آپ سے ہو سکے وہ دیجئے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ لڑکیوں کی شادی کے لئے عرضیاں لکھوائی جا رہی ہیں اعانت کی تا کہ لوگ اعانت کریں۔ میرے پاس ایک صاحب درخواست لائے۔ میں نے کہا کہ میں نہ لکھوں گا، ان کو بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا آخر شادی کے لئے روپیہ کی کیا ضرورت ہے؟ انھوں نے کہا کم از کم ایک پاندان کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن، کچھ جوڑے کپڑے تو ہوں۔ میں نے کہا یہ سب نہ ہوگا تو کیا ہوگا انھوں نے کہا ذلت ہوگی۔ میں نے کہا اس میں ذلت ہوگی اور ایک ایک کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں ذلت نہیں ہے۔

سیدۂ عالم کا مہر آپ کو معلوم ہے ایک سو سات روپئے تھا اور آپ کے نقطۂ نگاہ سے مہر زیادہ ہونا عورت کی عزت ہے مگر شرع میں عورت کے لئے مہر کا زیادہ ہونا سبب ذلت ہے۔

ولیمہ

ولیمہ بھی شرعاً سنت ہے مگر حسب حیثیت۔ یہ نہ ہو کہ ولیمہ اس طرح کیا جائے کہ دو دن تو خوب تعریفیں ہوئیں مگر جس وقت گھر پر قرقی آئے گی اور نیلام ہو رہا ہوگا تو یہی تعریف کرنے والے برا کہتے ہوں گے اور کہیں گے کہ لڑکی کی شادی میں اپنے تئیں تباہ کر دیا۔ یہ فضول رسمیں اور یہ ہندوؤں کی تقلید ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں فنا کی طرف لے جا رہی ہیں۔

یہ سمجھنا کہ اب تک علماء نے ان چیزوں کی اصلاح پر زور کیوں نہیں دیا، درست نہیں ہے۔ جس وقت جناب غفران مآبؒ ہندوستان میں تشریف لائے آپ کو نہیں معلوم کہ اس وقت کیا کیا ہوتا تھا۔ شیعوں کے یہاں شیخ سدو کا بکرا، احمد کبیر کی گائے اور نہ معلوم کس کی کڑھائی، یہ سب کچھ ہوتا تھا، بھوانی جی کی پرستش ہوتی تھی۔

اصلاح کی صورت یہ ہے کہ ہمیشہ تدریجی صورت اختیار کی جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ہمیشہ سے اس حکمت اور مصلحت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جس دن سے رسالت مآبؐ مبعوث ہوئے اسی دن سے نماز روزہ وغیرہ اتنے ہی حکیمانہ پہلو رکھتے تھے مگر آپ کو معلوم ہے کہ ان کے احکام ۱ھ، ۲ھ، ۳ھ میں نافذ ہوئے۔ جناب غفران مآبؒ نے پہلے ان چیزوں کو مٹایا جو لوگوں کو کفر اور شرک کی طرف لے جا رہی تھیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اُسی نقطہ پر رہیں جس نقطہ تک انھوں نے اصلاح کر دی چونکہ اب یہ منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ قدم آگے بڑھایا جائے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت ہم شریعت اہلبیتؑ کے آداب و رسوم کو پیش نظر رکھیں۔ شادی کو ایک مذہبی رسم سمجھا جائے اور ان فضول رواسم سے باز رہا جائے۔ مجھے نہایت خوشی ہے کہ ابن حسین صاحب نے آپ کے سامنے یہ نظیر پیش کی ہے جس میں فضول رواسم نہیں انجام دیئے گئے یہ بھی ایک عمدہ مثال ہے جو پیش کی جا رہی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد دنیا میں بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی۔

✿✿✿

ہمارے رسوم و قیود

خمار رسوم و قیود

ہماری اس ''سرگشتگی'' کی داستان بہت طولانی ہے۔ اسلام سادہ اور سنجیدہ اصول و تعلیمات لے کر آیا تھا مگر اس کی یہ سادگی کتنے دن قائم رہی؟ پس اتنے دن کہ جب تک پیغمبر اسلام زندہ رہے، اس کے بعد گونا گوں اسباب سے یہ صاف اور سادہ تعلیمات کچھ بے نام و نمود گھروں کے اندر محدود رہے ہوں تو ہوں مگر عام طور پر اسلامی تمدن اور تہذیب پر دوسرے ممالک کی ''خسروانہ'' معاشرت کا اثر پڑا اور آج جسے ''مسلمانوں کا کلچر'' کہہ کے اس کی بقاء کو ہندوستان میں اسلام کی بقاء کا مرادف کہا جاتا ہے۔ یہ وہی پنچ میل ''کلچر'' ہے جو مختلف ممالک کی معاشرت اور تہذیب کے اثر سے ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔

ہندوستان کا اسلام ان مقدس ذرائع سے آیا ہوا نہیں جو براہ راست اسلام کے تعلیمات کے حامل تھے بلکہ یہ ''سیکنڈ ہنڈیڈ'' (Second Handed) اسلام ہے جس میں پہلے ہی سے وہ خلوص اور نکھار باقی نہیں رہا تھا، وہ کچھ لباس پہنے ہوئے آیا تھا اور پھر مذہبی پر امن اور سادہ تبلیغ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ طاقت اور جبروت کے ساتھ ہندوستانی ممالک میں پھیلا تھا اس لئے یہاں کے مسلمانوں نے آنکھ کھول کر اگر ایک ہاتھ میں دیکھا قرآن، تو دوسرے ہاتھ میں دیکھی خون آشام تلوار جس پر مذہبی روایات کے ماتحت گویا یہ اعلان بھی تحریر تھا کہ اَطِیعُوا اللهَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ وَاُولِی الاَمرِ مِنکُم. یعنی بادشاہ

اولی الامر ہیں اور ان کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت کے ہم پلہ ہے اس لئے یہاں کے مسلمانوں کے دل میں خدا و رسول کے ساتھ ہی ساتھ عظمت و اقتدار کا اثر بھی قائم ہوا۔

پھر آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے سلاطین عموماً ترک اور مغل خاندانوں سے تھے جن میں ان کے خاندانی عادات و رسوم کا جو ترکستان اور ایران میں مروج تھے پورے طور پر عملدر آمد ہوتا تھا ہندوستان آکر سیاسی مصالح کے ماتحت انھیں یہاں کے ارباب اقتدار سے تعلقات قائم کرنا پڑے اور سلطان جلال الدین اکبر بادشاہ نے جو اکبر اعظم کہے جاتے ہیں، اپنے سیاسیات کے ماتحت مختلف اقوام و ملل میں شادیاں کر کے ان کی لڑکیاں لانے کی بھی ضرورت محسوس کی۔ آگرہ جایئے اور فتحپور سیکری کے شاہی محلات میں جودابائی کے محل کے ساتھ اس کا عبادت خانہ تک دیکھ لیجئے۔ ظاہر ہے کہ رسوم کا تعلق بہت زیادہ عورتوں کے ساتھ ہے شاہی محلات کے اندر ان تمام مختلف عناصر کے اجتماع سے جو بوقلموں رسوم و عادات جاری ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ بہت آسان ہے۔ پھر کوئی معمولی شخص ہو تو اس کے گھر کے تقریبات کی اطلاع بھی اس کے گھر تک محدود رہ سکتی ہے مگر بادشاہ کے یہاں جو تقریب اور رسم ہو اس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں کی شرکت کا امکان ہے اور لوگوں کی نگاہ میں سلاطین کے افعال قابل پیروی اور لائق اقتداء۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ جو رسم اور تقریب بادشاہ کے یہاں ہوئی، عمائد اور بڑے افراد نے اس کی پیروی کی اور اس کی اشاعت میں حصہ لیا۔ ان کے اثر سے جو ان کے وابستگان تھے انھوں نے وہی طریقے اختیار کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیزیں عام طور پر مسلمانوں میں زندگی کا جزو سمجھ لی گئیں۔ ممکن ہے کہ خالص مذہبی فرائض نظر انداز ہو جائیں مگر یہ رسوم

نظر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد ان رسموں کو قوت پہنچائی تو ہم پرستی نے۔

چونکہ ہم توہمات ہندوستان میں ہمیشہ سے بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر کبھی کسی وجہ سے کوئی رسم نہ ہوئی اور اتفاق سے اسی سال کوئی حادثہ ہو گیا تو اس کا یہ سبب قرار دیا کہ چونکہ وہ رسم نہیں ادا ہوئی تھی اس لئے یہ سانحہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے وہ رسوم اگر صرف ترجیحی حیثیت رکھتے تھے تو اب وہ اتنے لازم سمجھے جانے لگے کہ گویا زندگی ان پر موقوف ہے؟

آخر کو وہ سادے طریقے جو اسلام نے اپنے متبعین کے لئے قرار دیئے تھے اس درجہ ان زوائد اور اضافوں میں گھر گئے کہ ان کی اصلی صورت مخفی ہو گئی۔ پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ اصلی چیز کیا تھی جو ہمارے لئے قرار دی گئی تھی۔

جس وقت سے انسان عالم وجود میں آیا (بلکہ آیا نہیں آنے کی تیاری ہوئی) اس وقت سے وہ رسوم کے شکنجہ میں کس دیا گیا اور پھر وہ قید ہستی سے آزاد ہو جائے مگر ان رواسم کے قیود سے وہ اس کے بعد بھی آزاد نہ ہو گا۔

پھر اگر یہ رسمیں بالکل خشک رسمیں ہوتی یعنی ان میں روپیہ کے صرف کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو شاید ان کی وجہ سے کچھ نقصان نہ ہوتا مگر ان میں ہر ایک رسم شاہانہ تزک واحتشام کی حامل ہے اور ہر ایک رسم کے کچھ لوازم ہیں جو روپیہ کے طالب ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف تقریبات جیسے شادی، بیاہ، ختنہ اور اس سے چھوٹی باتیں کھیر چٹائی، دودھ بڑھائی وغیرہ بھی اس قدر دشوار ہو گئیں کہ جب تک کچھ سرمایہ نہ ہو ایک معمولی رسم ادا نہیں ہو سکتی۔

حالانکہ ان رسموں پر جب خیال کیا جاتا ہے تو بعض باتیں بالکل خلاف شرع

ہیں اور بعض فضول، بے کار اور غلط توہمات پر مبنی ہیں اور بعض کم از کم اقتصادی حیثیت سے نقصان رساں ہیں۔

ان رسموں کی فہرست مکمل طور پر پیش نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جو شہروں کے اعتبار سے خاندانوں کے لحاظ سے مختلف ہے بلکہ ایک ہی خاندان میں کسی گھرانے میں کوئی رسم ہے اور کسی میں کوئی اور۔ پھر جس طرح شریعتیں منسوخ ہوتی تھیں اسی طرح رسموں میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں جس کو کہتے ہیں "ریت بدلنا" گویا جس طرح آب وہوا کی تبدیلی سے حفظان صحت پر اثر پڑتا ہے اسی طرح ریت بدلنے سے گھر کی خیر وسلامتی پر کوئی خاص اثر پڑے گا۔ مگر پھر بھی بعض رسموں کو اشارۃً یا تصریحاً بیان کروں گا۔

جس وقت سے کہ بچہ کی ولادت ہوئی، اس وقت سے اسلام نے خدا کا نام یاد دلانے کا انتظام کیا۔ گویا اسی وقت وہ مقصد انسان کے پیش نظر کردیا جائے جس کے لئے وہ دنیا میں آیا ہے۔ یہ حکم دیا گیا کہ بچّے کے داہنے کان میں اذان کہو اور بائیں میں اقامت کہو۔ اس کو چاہے بچہ سمجھے یا نہ سمجھے مگر دیکھنے والوں پر اثر ہوگا اور انھیں فرائض زندگی کی تکمیل کا احساس ہوگا مگر آپ کو معلوم ہے کہ اس موقع پر آپ کے یہاں کیا رسم ہے۔ چپا بجانا، تو اکھٹکھٹانا، ظاہر میں تو ایک معمولی بات ہے مگر دیکھئے اس سے کس ذہنیت کی تشکیل ہوتی ہے۔

زچہ خانہ کے دنوں میں چاندنی سونپی جاتی ہے۔ معلوم نہیں یہ رسم کن کن گھرانوں میں ہے۔ یہ چاندنی کا سونپنا زخم میں بھی ہوتا ہے اور شاید چیچک میں بھی۔ اس رسم کی اصل بنیاد مشرکانہ عقیدہ پر ہے۔ یہ خیال کہ چاند کا کوئی اثر ہے تو چاندنی کو سونپا جائے، دیوتاؤں کے عقیدہ پر مبنی ہے جیسے بیماریوں کی جھاڑ پھونک۔ اس کا کوئی تعلق توحید

کے ساتھ نہیں ہے۔ چونکہ عوام اس پہلو سے بالکل خالی الذہن ہوتے ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو چاندنی کو سونپے وہ کافر ہے مگر رسم کے مہمل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ بعض محتاط گھرانوں کی عورتیں اس میں یہ ترمیم کرتی ہیں کہ چاندنی سونپنے میں خدا اور رسولؐ اور ائمہ معصومینؑ کا بھی نام لے دیتی ہیں مگر اس کی وجہ سے چاندنی کو سونپنے کی تو کوئی معقول وجہ پیدا نہیں ہوسکتی۔

چیچک میں لکھنؤ سے باہر بہت سے مقامات پر تو ''بھوانی جی'' کی نیاز بھی دلائی جاتی ہے اور اسے راضی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ ہرگز اسلام میں صحیح و درست نہیں ہے اور جائز نہیں ہے۔

شادی بیاہ کے معاملہ میں جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو خیالات کا بہت زیادہ غلبہ ہے۔ ہندوؤں میں بہت قدیم زمانہ میں یہ رسم تھی کہ لڑکی کو جنگ کر کے بطور مال غنیمت لے جایا کرتے تھے اس رسم کے نشان آج تک ہمارے یہاں کی رسموں میں نظر آتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ جس وقت براتی دولہا کے گھر جاتے ہیں تو جب تک عقد نہ ہو جائے ان کے ساتھ مخالفانہ طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے کچھ کھانا پانی یہاں تک کہ پان بھی انھیں نہیں دیا جائے گا جب تک کہ عقد نہ ہو جائے۔ یہ کیا ہے؟ یہی کہ اب تک گویا یہ ایک فریق ہے اور وہ دوسرا فریق ہے۔ جب جنگ فتح ہو جائے گی تب دونوں ایک ہوں گے۔

پھر دولہا کو گھوڑے پر بٹھانے کی رسم۔ چاہے اس کو بیٹھنا آتا نہ ہو۔ دو دو آدمی ادھر اُدھر سے پکڑے رہیں مگر گھوڑے پر ہونا ضروری ہے۔ اس لئے تو کہ جنگ ہے اور اس میں شہسواری کی ضرورت ہے۔ اکثر سر کے اوپر کھنچی ہوئی تلواروں کا سایہ بھی ہوتا

ہے۔ اس کا پورا مظاہرہ چوتھی کی رسم میں ہوتا ہے۔ ایک فریق ایک طرف دوسرا فریق دوسری طرف۔ وہ دولہا والے یہ دُلہن والے۔ ایک دوسرے پر حملے ہو رہے ہیں اور دار جاری ہیں۔ کسی زمانہ میں تبر تیر نیزہ و شمشیر ہوتے تھے۔ آج مولی گاجر امرود سیب وغیرہ ہیں چاہے چوٹ چپیٹ آئے چاہے تکلیف ہو مگر کوئی پرواہ نہیں کیونکہ یہ تو لڑائی ہے اور لڑائی میں لڈو پیڑے نہیں بٹتے ہیں۔

شادی کا لباس جو دولہا کو پہنچایا جاتا ہے اسے دیکھئے۔ آپکو معلوم ہوگا کہ اسے ہماری عام معاشرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ کوئی خوبصورت اور دلکش لباس بھی نہیں ہے بلکہ وہ تو بجائے آراستہ کرنے کے صورت کو بگاڑ دیتا ہے مگر یہ لباس ہمارے یہاں بالکل ہندوؤں کی مماثلت میں جاری ہے۔

کنگنا اور سہرا شادی کے ایسے لوازم ہیں جو جدا نہیں ہو سکتے۔ سہرا کسی حد تک دولہا کے چہرے پر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پھولوں کا ہے تو اس کی خوشبو بھی کیف آور ہو سکتی ہے مگر کنگنے کا کیا کہئے گا۔

پھر یہ دیکھئے کہ یوں تو لباس ہر ایک کا جداگانہ ہے۔ کوئی شیروانی پہنتا ہے، کوئی انگرکھا، کوئی اچکن، مگر شادی کا خلعت سب کا متحد ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لباس کی یہ رسم کسی خاص اثر کے ماتحت قائم اور جاری ہوئی ہے۔ اور وہ کچھ نہیں ہو سکتا سوائے شاہی جلال و جبروت کے اثر کے جس کی تشریح میں پہلے کر چکا ہوں۔

بعض رسمیں ایسی ہیں جن سے بعض اوقات بڑی تکلیف ہوتی ہے جیسے لڑکی کو مانجھے بٹھایا جانا۔ یعنی جب کچھ دن عقد کے رہ جائیں گے تو کچھ مخصوص آداب و شرائط کے ساتھ وہ ایک کوٹھری کے اندر بٹھلا دی جائے گی۔ اس کے بعد اسے کپڑے بدلنے کی

اجازت نہیں روزانہ اس کے جسم پر بٹنا ملا جائے گا اور اس کی مرمت ہوتی رہے گی یہاں تک کہ عقد کی تاریخ آئے۔ اب اگر اتفاق سے عقد کی تاریخ ٹل گئی اور کچھ روز بعد مقرر ہوئی تو جس وقت تک عقد نہ ہو اس وقت تک اسی طرح سے کوٹھری میں بیٹھی رہنا چاہئے۔ عقد کے بغیر مانجھے سے اُٹھانا لڑکی کا ایک بڑی قیامت کی بات ہے جسے مشکل سے گوارا کیا جاتا ہے۔ اس مانجھے بٹھانے اور روز بٹنا ملے جانے کے بغیر کہا جاتا ہے ''چہرہ پر نور نہ آئے گا''

اب آپ دیکھئے کہ اس دوران میں ممکن ہے فرائض شرعی کے ماتحت اس لڑکی کے لئے نہانا ضروری ہو مگر کیا رسم کی لازمی پابندی کے مقابلہ میں فریضۂ مذہبی کا کوئی خیال کیا جائے گا؟!

بری، سانچق، ایک ہی طرح کی چیزیں ہیں۔ اصطلاح مختلف ہے کہیں سانچق کہی جاتی ہے اور کہیں بری۔ اس کی شکلیں بھی جداگانہ ہیں۔ مٹکیاں، ان پر سُرخ شالباف منڈی ہوئی، ان میں مچھلیاں ٹنگی ہوئی آخر اس شکل وصورت کی کوئی معقول وجہ ہوسکتی ہے؟ ہاں سفر کے وقت بھی ''دہی مچھلی'' کہنا مبارک سمجھا جاتا ہے یہاں بھی مچھلیوں کی شکل اور مٹکی کے اندر دہی۔ ممکن ہے اس مناسبت سے ہو کہ لڑکی کا ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف سفر ہے۔

بعض اصحاب نے بیان کیا کہ ''مچھلی'' ہندوؤں کا قومی نشان ہے پھر تو مسلمانوں کی شادیوں میں اس رسم کی بنیاد سوائے ہندوانہ ذہنیت کی تاثیر کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔

اب آئی اصل عقد کی منزل جس کا ذریعہ ہے ایجاب وقبول۔ اس میں مہر

شریعت کی طرف سے ضروری قرار دیا گیا ہے مگر ہمارے یہاں مہر اس شرعی اصول پر باقی نہیں رہا جو اس کے قرار دیئے جانے کا منشا تھا مہر حقیقۃً ایک مطالبہ تھا جو عورت کی طرف سے مرد کے ذمہ واجب الادا ہے مگر ہمارے رسم ورواج کی عملداری میں مہر صرف ایک نام کی چیز یا دکھاوے کی بات یا شان واقتدار کے ظاہر کرنے کا لفظی ذریعہ رہ گیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اصلیت باقی نہیں رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک وہ شخص جس کی کوئی حیثیت بھی نہیں۔ جس وقت شادی کرنے پر آمادہ ہوتا ہے اور محفل عقد میں دولہا کی حیثیت سے مسند پر جلوہ گر ہوتا ہے، تو اس کے سامنے دس لاکھ یا کم از کم پچاس ہزار روپیہ مہر پیش کیا جاتا ہے اور وہ اقراری طور پر اس طرح سر ہلا دیتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کے صندوق میں اتنا روپیہ اس وقت موجود ہے حالانکہ اگر اس شخص سے کہا جائے کہ وہ کسی شخص کے نام اتنی رقم کا پرونوٹ لکھ دے تو وہ تیار نہ ہوگا اور کہے گا کہ میں اتنی رقم ادا کہاں کرسکتا ہوں مگر مہر میں اس کو کوئی عذر نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مہر کو واجب الادا نہیں سمجھتا۔ ایک لفظی بات ہے ''لاؤ بھائی پچاس ہزار نہیں، پچاس لاکھ سہی'' میں سچ کہتا ہوں کہ اگر اس شخص سے بلکہ اس محفل عقد کے بیٹھنے والوں سے پوچھا جائے کہ پچاس ہزار روپیہ کتنا ہوتا ہے یعنی رکھا جائے تو اس کے لئے کتنی جگہ کافی ہوگی (پچاس لاکھ کا ذکر نہیں) تو کوئی اس کا تصور بھی نہ کرسکے گا اس لئے کہ اس نے کوئی مقدار ایسی بھی نہیں دیکھی ہے جو پچاس ہزار سے قریبی تناسب رکھتی ہو۔ مگر عام عالم الفاظ میں پچاس ہزار دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جائیں گے۔ یہ مہر قرار پا گیا۔ اس کے بعد؟ ابھی تو شادی ہو رہی تھی۔ اس کے بعد چوتھی چالے اور خدا جانے کیا کیا۔ چاند مقرر ہیں کہ یہ چاند یہاں دیکھا جائے اور یہ وہاں۔ اس کے تفاصیل بہت طولانی ہیں۔ اب اگر اولاد کی نوبت آئی تو پھر نہ پوچھئے۔ جو مہینہ گزرتا ہے

ہمارے سماج میں تو
ہے کہ میرے ماں باپ کی اولادیں نہیں ہیں مگر میرے چچا کے دودھ شریک بھائی کے
بچے ہیں تو ہمارے بھائی ہوئے۔
یاد رکھئے کہ جہاں تک بغیر کسی اونچ نیچ کے "بھائی" "چچا" وغیرہ ہونے کے
حوالے ہے وہاں تک شرع نے قرابتداری کا لحاظ کیا ہے مگر جہاں سے "ہوتے ہیں" کے
شروع ہوئے وہاں شرع نے قرابت کا اعتبار نہیں کیا ہے۔
چچازاد بھائی، لیکن آپس میں ایک دوسرے کے نامحرم ہیں اسی لئے آپس میں
شادی ہو سکتی ہے مگر ہمارے یہاں کی خودساختہ شرع یعنی رسم کے لحاظ سے وہ محرم قرار
دیئے گئے ہیں اس لئے عورت ان تمام دور کے عزیزوں کے سامنے ہوتی ہے۔ اگرچہ اس
زمانہ میں جب کہ پردہ کوئی چیز ہی نہیں سمجھا جا رہا ہے اور بڑے بڑے اونچے خاندانوں
میں بالکل اٹھایا جا رہا ہے۔

میرے اس بیان پر مضحکہ کیا جائے گا مگر مجھے تو یہاں اُن لوگوں سے مطلب ہے
جو پابندی شریعت کا دعویٰ کرتے ہیں اور جہاں پردہ باقی سمجھا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ
پردہ نہیں ہے جس کو شرع نے لازم قرار دیا ہے۔ اب دیکھئے کہ دولہا کے جب مہندی
لگانے میں حقیقی بہنوں کے علاوہ دوسری طرح کی بہنوں کا بھی ہاتھ لگا تو یہ خلاف شرع ہوا یا
نہیں۔

اسی طرح میں نے سنا ہے کہ جس وقت دولہا کا عقد ہو چکتا ہے اور وہ سلام
کرنے کے لئے گھر کے اندر جاتا ہے تو اس وقت پردہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا سب عورتیں
سامنے ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقد تو ایک کے ساتھ ہوا مگر محرم سب ہو گئیں۔
مانجھے کے سلسلہ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ لڑکی جو مانجھے میں بیٹھتی ہے اس کو کپڑے

بدلنا، نہانا سب ممنوع ہے۔ کیا اس کا بعض صورتوں میں شرعی احکام وفرائض کے ساتھ تصادم نہیں ہوتا۔

بعض رسمیں ایسی ہیں کہ ان کے متعلق اگر آپ علماء سے دریافت کیجئے تو وہ ناجائز نہ کہیں گے۔ جیسے کنگنا، سہرا وغیرہ۔ کنگنا کیا چیز ہے۔ گول شکل کا ایک لٹو۔ اس کو ہاتھ میں ہر وقت کوئی باندھے رہے تو کیا ہے۔ مگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پابندی سے ہماری جس زندگی کی تشکیل ہوتی ہے وہ ہماری فنا کی تمہید ہے۔

یہ دیکھئے کہ ان رسموں کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ بہت سی لڑکیاں قابل عقد ہیں بلکہ جن کا سن شادی کا گزر چکا ہے اور وہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کی شادی صرف اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ روپیہ نہیں شادی کس طرح ہو۔ کیا اسلام نے شادی کا جو طریقہ مقرر کیا ہے اس کے لئے اتنے روپیہ کی ضرورت ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ وہی ہندوانی شادی ہے جس کے لئے روپیہ کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اس سے کبھی تو ان بے زبان لڑکیوں کی جسمانی زندگی تباہ ہوتی ہے یعنی وہ مختلف امراض کا شکار ہو جاتی ہیں اور کبھی اجتماعی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے یعنی نسل قطع ہوتی ہے اور اس سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ کبھی ناموسی زندگی فنا ہو جاتی ہے یعنی وہ خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں جو شرافت کے دامن پر دھبّا لے آئیں اور عزت کی پیشانی کو عرق شرم سے تر کر دیں۔

اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اُن ماں باپ پر جو اُن کو حکم شرع کے خلاف بٹھلائے ہوئے ہیں اور یہ بٹھلانا کس بنا پر ہے؟ ان ہی رواسم کے غلط تخیل پر جو رائج ہو گئے ہیں۔

جس صورت میں کہ لڑکی بیٹھی نہیں رہی بلکہ اس کی شادی کی گئی تو آپ جانتے ہیں کہ وہ شادی ہوتی کس طرح ہے؟ قرض لے کر قرض بھی غیر سودی تو ملتا نہیں۔ ملے گا تو

سودی قرضہ ملے گا اور وہ کس سے لیا جائے گا؟ ان ہی لوگوں سے جن کے پاس ان سودی
قرضوں کی بدولت ہماری تمام جائدادیں منتقل ہو چکی ہیں۔
لالہ صاحب تشریف لائیں گے اور چونکہ ہم صاحبِ حاجت ہیں اس لئے منہ
مانگا سود مقرر کریں گے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ شادی تو ہوگئی اور بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی اور تعریفیں بھی
خوب ہو رہی ہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ یہ تعریفیں کرنے والے، اس وقت جب گھر پر قرقی آئے
گی اور مکان نیلام ہوتا ہوگا، یہی لوگ اس وقت بیوقوف بناتے ہوں گے کہ روپیہ پاس
نہیں تھا تو اتنا تزک واحتشام دکھانے کی ضرورت کیا تھی؟ سود در سود میں رہا سہا جو پاس تھا
وہ سب تشریف لے گیا۔ خانہ آبادی نہ ہوئی خانہ بربادی ہوگئی اور پھر نقصان مایہ وشماتت
ہمسایہ کا مضمون ہوا۔

مہر کا جو اصول آپ نے مقرر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک
بے معنی لاحاصل غیر معقول چیز ہوگیا شرع کی طرف سے مقررہ کردہ مہر ایک لازمی قرضہ کی
حیثیت رکھتا تھا مگر قانون نے اس کو منسوخ کر دیا۔ وہاں حسب حیثیت دلایا جائے گا۔ اس
سے ایک شرعی اصول کی توہین ہوئی۔ مگر اس کا سبب کیا ہوا۔ ہمارا غلط طرز عمل۔ ہم نے
شرعی اصول کو غیر عقلی لباس پہنا دیا جس کے بعد وہ قابل تسلیم ہی نہ رہا۔

جب آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ پچاس لاکھ یا پچاس ہزار مہر کس واسطے؟ تو
جواب ملتا ہے کہ ماں کا مہر یہی تھا، نانی کا یہی تھا، پرنانی کا یہی تھا اس لئے اس کا بھی یہی
مہر ہوگا لیکن اگر پوچھا جائے کہ نانی یا پرنانی کی جب شادی ہوئی تھی تو گھر پر ہاتھی بندھے
ہوئے تھے۔ اب تو ایک چھوٹا سا گھوڑا بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں سیکڑوں آدمیوں کی

یہاں سے پرورش ہوتی تھی۔ اب کبھی کبھی خود گھر میں فاقہ کی نوبت آجاتی ہے۔ اس وقت ہزاروں روپیہ کا ساز وسامان موجود تھا اب بچھانے کے لئے فرش تک نہیں ہے۔ کہا جائے گا کہ مہر تو اتنا ہی ہوگا۔

بہتر "اتنا ہی ہوگا" مگر اس کا حاصل کیا ہے کیونکہ نہ وہ دین میں ملے گا نہ دنیا میں۔ دنیا کا حال تو آپ کو معلوم ہوا کہ وہاں حسب حیثیت دلوایا جاتا ہے اور دین میں بھی یہ ظاہر ہے کہ امکان شرط ہے جب شوہر کو تمکن ہی نہیں تو آخرت کی ذمہ داری بھی کوئی نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اگر کبھی بے چارہ دولہا مہر کی قبولیت میں عذر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اتنا مہر نہیں دے سکتا مجھ میں وسعت ہی نہیں۔ تو اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے کہ اس وقت نہ سہی۔ ممکن تو ہے۔ خدا تو قادر ہے۔ ایک مسلمان آدمی کے سامنے جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو وہ بے بس ہو جاتا ہے اس کے لبوں پر مہر خاموشی لگ جاتی ہے مگر قصد تو فطری چیز ہے۔ کیا ہمارے اس منطقی داؤں سے اس کو قصد اِتنے روپیہ کے دینے کا ہو سکتا ہے؟۔ ہرگز نہیں جب کہ اپنے حالات کے لحاظ سے وہ اس کے تصور سے بھی بالاتر ہے۔

میرے نزدیک یہ استدلال ہی بالکل غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کا نظام اسباب پر قائم ہے اور ہر چیز کے لئے ایک سبب قرار دیا گیا ہے اس عالم کا نظام ان ہی اسباب پر مبنی ہے ان اسباب کے خلاف صورت اگر پیدا ہو تو وہ معجزہ ہے۔ مگر معجزہ کی توقع ہر شخص کو تھوڑی کرنا چاہئے۔ معجزہ خاص اوقات خاص اسباب اور خاص حالات کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اگر ہر شخص کے لئے ایسا ہو تو معجزہ معجزہ ہی نہ رہے وہ نشان حقانیت ہی باقی نہ رہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ انبیاؑ و مرسلین اور ائمہ بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان ہی اسباب کے پابند تھے جن کے ہم پابند ہیں۔ ان کے لئے بھی معجزہ خاص ضرورت کے

وقت پر ظاہر ہوتا تھا اور نہ نہ معجزہ کی اہمیت باقی رہتی نہ ان کی زندگی اور سیرت ہمارے لئے نمونہ رہتی۔

ہم کو کوئی حق نہیں ہے اس توقع کا کہ ہمارے لئے اس عام نظام اسباب کو توڑ دیا جائے اور ہمارے لئے معجزہ ظاہر ہو۔ حضرت عیسیٰ پانی پر چلتے تھے ہم تو جب تک پاسپورٹ لے کر اور ٹکٹ خرید کر جہاز پر نہ بیٹھیں سمندر کا سفر نہیں کر سکتے ہم بغیر ذریعہ کے ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اس بارے میں خدا پر توکل کا سوال نہیں پیدا ہو سکتا۔ کیونکہ توکل کا درجہ اپنے قوائے عمل کے استعمال کے بعد ہے۔ آپ کو مدرسۃ الواعظین تشریف لانا تھا۔ گھر میں بیٹھے رہتے، خدا کی قدرت میں تو یہ تھا کہ وہ آپ تک یہاں کی تقریر کو گھر ہی میں پہنچا دیتا کیوں نہ آپ نے خدا پر بھروسہ کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ توکل کے یہ معنی نہیں ہیں۔ یہ خیال کرنا خدا کی حکمت پر دھبًا لگانا ہے۔ اگر اسی طرح نظام کو توڑ پھوڑ کرتا رہتا تو دنیا میں کوئی آئین اور قاعدہ قائم ہی نہ ہوتا۔

معلوم ہوا کہ ہمارے عام نظام زندگی میں ممکن اور غیر ممکن کے معنی ''ممکن عادی'' اور ''عادۃً غیر ممکن'' کے ہیں اس لحاظ سے جب دیکھا جائے تو وہ انسان جو نان شبینہ کو محتاج ہو اُسے اپنی موجودہ زندگی میں لاکھ دس لاکھ روپیہ حاصل ہونا غیر ممکن ہے۔ خدا کی قدرت میں یہ اُسی طرح ہے جیسے ہمارا ہوا میں پرواز کرنا، سمندر پر بغیر کسی جہاز اور کشتی کے فن شناوری جانے بغیر رواں ہونا۔ ویسے ہی دس لاکھ روپیہ بیٹھے بیٹھے یوں ہی مل جانا۔

پھر اگر ہوا میں پرواز کا قصد آپ کو پیدا نہیں ہو سکتا۔ پانی کی سطح پر راستا چلنے کا ارادہ پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ اسے غیر ممکن سمجھتے ہیں تو دس لاکھ روپیہ دینے کا قصد آپ کو کیسے پیدا ہوگا؟ سمجھ لیجئے کہ یہ طفل تسلی کہ اس مہر کو منظور کر لو کیونکہ ممکن تو ہے؟ خدا قادر تو

ہے؟ بالکل دھوکا اور فریب ہے۔

مہر کیوں زیادہ رکھا جاتا ہے؟ خیال یہ ہوتا ہے کہ مہر زیادہ ہوگا تو لڑکی کا دباؤ شوہر پر ہوگا۔ اس کے لئے میں کہتا ہوں کہ شوہر کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے آپ زیادہ سے زیادہ مہر ایسا مقرر کر دیں جسے وہ اپنی عمر بھر میں مشکل سے ادا کر سکے اگرچہ وہ بھی سیدۂ عالمؑ کے مہر کے خلاف ہوگا مگر شرع نے اس کی پابندی آپ پر واجب نہیں قرار دی ہے اس لئے آپ اس سے زیادہ بھی مقرر کر سکتے ہیں مگر براہ مہربانی اتنا زیادہ نہیں جو حدود و خیال میں نہ آئے اور جس کا کسی طرح امکان ہی نظر نہ آتا ہو۔

یہ رسمیں جو قرار پا گئی ہیں۔ اکثر صاحبان علم اور تعلیم یافتہ افراد جو وسیع الخیال ہونے کے دعویدار ہیں وہ اپنی روشن خیالی کے مظاہرہ میں ان پر اظہار بیزاری کرتے ہیں مگر مقام عمل میں وہ بھی ان کے پابند نظر آتے ہیں۔ مشکل سے کوئی فرد اس سے مستثنیٰ ہوگی ان پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ عورتوں سے مجبور ہیں۔ کچھ بس نہیں چلتا۔ اس کے متعلق عرض ہے پہلی بات یہ کہ عورتوں کی ذہنیت کی تشکیل خود مردوں کے ذمہ ہے یعنی شروع ہی سے عورتوں کے ذہن میں ایسے خیالات جاگزیں کرنا چاہئیں کہ وہ ان رسموں پر اصرار بیجا کریں ہی نہ کیونکہ انسان اپنے گھر والوں کے اخلاق کی درستی اور تربیت کا ذمہ دار ہے "کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ"، "تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا حکمران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا" یعنی پوچھا جائے گا کہ اس نے کیسی تربیت کی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو ایک عام فریضہ ہے تمام لوگوں کی نسبت حکم ہے کہ اچھے کاموں کی ہدایت کرے اور بری باتوں سے ممانعت کرے۔ چہ جائے کہ اپنے افراد وہ تو اپنے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے ہیں جن کی ہر طرح کی

نگرانی اس شخص پر عائد ہے لہٰذا اس کا فرض ہے کہ وہ شروع ہی سے بہترین خیالات کی تلقین کرے۔ اگر آپ شروع سے اپنے گھر والوں کو اس طرح کے تذکرے سناتے رہیں اور سیدۂ عالمؑ کی سیرت انھیں یاد دلاتے رہیں تو ان کے ذہن میں وہ خیالات راسخ ہوجائیں گے اور وہ وقت آنے پر اصرار بیجا کے ساتھ آپ کی زحمت کی باعث نہ ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ گھر والوں کا اصرار بےجا ہے تو آپ اتنے نرم اور ملائم کیوں ہوجاتے ہیں کہ ان کے کہنے میں ضرور آجائیں۔ آپ اپنی ذاتی باتوں میں تو اکثر حدِّ اعتدال سے قدم آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اسلام نے شوہر وزوجہ کے درمیان ایک حد تک مساویانہ حقوق قرار دیئے ہیں۔ عورت کی حیثیت ایک کنیز کی سی ہرگز نہیں ہے۔ عورت پر شوہر کی اطاعت اس طرح واجب نہیں ہے جس طرح ماں باپ کی اطاعت اولاد پر یعنی سوائے واجبات اور محرمات کے ہر بات میں ان کے حکم کو ماننا ضروری ہے۔ شوہر کی اطاعت زوجہ پر اس طرح غیر محدود نہیں ہے بلکہ وہ اُن ہی امور میں جو تعلقات زوجیت کے تحت میں داخل ہیں۔ اور جو اس کے قیام آمد ورفت سے تعلق رکھتے ہیں اس کے علاوہ کسی بات میں اطاعت واجب نہیں ہے۔ شوہر کو زوجہ سے اس طرح کی خدمت لینے کا حق نہیں ہے۔ جیسے کھانا پکانا، کپڑے سینا، جھاڑو دینا بلکہ پانی پلانا اور کھانا دینا یہ چیزیں عورتوں کے ذمہ واجب نہیں ہیں۔ بیشک ان باتوں کو اصول محبت کے تحت میں انجام پانا چاہئے یہ تو انتظامی حیثیت سے تقسیم عمل کا تقاضا ہے کہ اگر شوہر کاروبار، محنت، مزدوری یا تجارت کے سلسلہ میں گھر کے باہر کا کام انجام دیتا ہے تو عورت گھر کے اندر کا کام انجام دے شوہر کا کیا ذکر ایک گھر میں ماں اور بیٹے ہوں۔ بیٹا طلب معاش میں باہر رہتا ہے تو ماں کا انتظامی فرض ہے کہ وہ کھانا پکا کر رکھے مگر کیا اس کے معنی ہوئے کہ ماں پر

بیٹے کی اطاعت واجب ہوگئی۔ اسی طرح ایک گھر میں بھائی اور بہن ہوں تو وہاں یہی صورت ہوگی۔ اسی طرح سمجھ لیجئے شوہر اور زوجہ کو۔ مگر اس کے یہ معنی تھوڑی ہیں کہ آپ کی حکومت قائم ہوگئی اگر کبھی وقت پر کھانا نہ تیار ہوا تو تیوریوں پر بل آگئے۔ اگر سالن بدمزہ ہوا تو پیالہ اٹھا کر صحن میں پھینک دیا۔ یہ باتیں وہ ہیں جن میں لوگ حد اعتدال سے قدم آگے بڑھا دیتے ہیں مگر وہ باتیں جن میں عورتوں کے کہنے پر نہیں چلنا چاہئے ان میں ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ قرآن میں تو یہ ہے کہ "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" یعنی مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں مگر یہاں معاملہ برعکس ہو جاتا ہے "اَلنِّسَآءُ قَوَّامَاتٌ عَلَى الرِّجَالِ" یعنی عورتیں مردوں پر حکمراں ہوتی ہیں۔ اگر آپ واقعی ان رسموں کی مضرت کا احساس رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی بات پر قائم رہنا چاہئے اصرار بیجا کو ٹھکرا دینا چاہئے اور خاطرداری کے اصول کو پامال کرنا چاہئے جب کہ آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے آپ کی قومی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔

مجھے اتفاق ہوا ایک مرتبہ ایک عقد میں شرکت کرنے کا۔ نوشاہ جن کا عقد ہو رہا تھا بی۔اے۔ تھے۔ ان کے والد ماشاء اللہ انگریزی داں، قوم پرست اور تحصیلدار۔ ماموں ایک کالج کے پروفیسر غرض سب روشن خیال یعنی خانہ تمام آفتاب۔ مجھ سے عقد پڑھنے کا وعدہ ہوا اور چونکہ جانا دور تھا اس لئے قرار پایا کہ اُسی موٹر پر جس پر دولہا جائے گا میں بھی سوار ہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا موٹر آیا اور ہم لوگ روانہ ہوئے۔ دیکھا تو دولہا سر سے پیر تک سُرخ لباس پہنے ہوئے جس میں لچکا پٹھا اور نہ معلوم کیا کیا ہاتھ میں کنگنے کے ساتھ ایک کٹاری بھی بندھی ہوئی اور چہرہ پر چار چار سہرے جن کے بار سے گردن کا اُٹھانا مشکل، گرمی سخت تھی اور دوپہر کا وقت تھا میں خاموشی کے ساتھ روانہ ہوا جب شہر کے حدود ختم

ہوئے اور باہر نکلے تو میں نے نوشاہ سے کہا کہ اب آپ سہرا الٹ دیجئے، بہت گرمی ہے، جب وہاں پہنچیں گے تو پھر سہرا ڈال لیجئے گا۔ انھوں نے جو مجھے اپنے حال زار پر مہربان پایا تو کہنے لگے میں نے تو سمجھ لیا کہ جس دن کسی کا عقد ہو اس دن وہ اپنے تئیں مردہ سمجھ لے۔ مجھ کو موقع مل گیا۔ میں نے کہا آپ تو تعلیم یافتہ ہیں آپ کے والد اتنے اصلاح پسند اور آپ کے ماموں ایسے۔ پھر آپ کے یہاں یہ پابندیاں کیسی؟ جواب دیا کہ میں نے کہا تھا مگر والد نے مجھے ڈانٹ دیا۔ دوسرے دن ان کے والد سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے تذکرہ کیا اور کہا کہ آپ کے یہاں ایسی باتوں کا ہونا تعجب ہے۔ کہا "جی ہاں ان باتوں کو بُرا تو میں بھی سمجھتا ہوں مگر ایک خالہ ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو گیا۔" میں نے دل میں کہا کہ ایک خالہ تھیں جب تو یہ ہوا۔ اگر ماشاءاللہ گھر عورتوں سے بھرا ہوتا تو کیا ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ صرف روشن خیالی کا ایک مظاہرہ ہے یا اسے فیشن سمجھ لیجئے کہ یہ ان باتوں کو زبان سے بُرا کہتے ہیں لیکن اگر حقیقۃً انھیں ان برائیوں کا احساس ہوتا اور اہمیت نگاہ میں ہوتی تو یہ ضرور سدِّ راہ ہوتے۔

اچھا ان باتوں کو نظر انداز کیجئے۔ طرفین کی رضامندی تو عقد کے لئے شرعی حیثیت سے قطعاً لازم وضروری ہے مگر آپ کے یہاں کے رواسم میں اس کی جگہ نہیں۔ لڑکی کا منشا کسی طرح معلوم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اگر کسی طرح لڑکی کی عدم رضامندی کا علم ہو جائے تو کبھی کبھی ماں باپ کو ضد ہو جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اب تو ہم یہیں کریں گے۔ اس کی وجہ سے معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بے شک آپ کے یہاں شرم وحیا کا لحاظ قابل قدر ہے مگر آپ ایسے ذرائع اختیار کریں کہ شرم وحیا کے ٹوٹے بغیر اُنکا منشا معلوم ہو سکے اس کے لئے ایک بہترین صورت یہ ہے کہ اُن سے کسی اور لڑکی کا نام

لے کر مشورہ کیجئے کہ اس کا عقد فلاں لڑکے کے ساتھ کیا جائے؟ اس طرح وہ اپنے خیال کا آزادی کے ساتھ اظہار کردیں گی اور آپ کو اس خیال کی پابندی لازم سمجھنا چاہئے۔

یہ سمجھ لینا کہ صاحب معاملہ ہم ہیں۔ وہ کچھ نہیں، غلط ہے۔ شرعاً تو صاحب معاملہ وہی ہیں۔ عقد کے وقت وکالت عقد اُن سے حاصل کی جاتی ہے مگر آپ نے رسمیں ایسی قرار دے لی ہیں کہ اُن کی رضامندی وعدم رضامندی کا اس میں پتہ نہیں چل سکتا جب وکیل عقد اُن سے دریافت کرے تو سکون کرنا رسم، پاس بیٹھنے والیوں کا اصرار کرنا کہ ''ہوں'' کہہ دو داخل رسم۔ اِدھر اُدھر کی زبردستی سے ''بجبوری'' ان کا ہوں کہنا رسم، اس ''ہوں'' کے بعد رونا داخل رسم۔ اب بتائیے کہ کوئی لڑکی ناراض بھی ہے تو وہ کس طرح اپنی ناراضگی کا اظہار کرے؟ اور ہم کس طرح اندازہ کریں کہ یہ لڑکی ''ہوں'' بخوشی کہہ رہی ہے یا بجبر؟ ہر چیز میں بدشگونی کی طرف نظر جاتی ہے مگر اس رونے میں بدشگونی کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ ممکن ہے کہ کبھی کوئی لڑکی عقد کے موقع پر ناراضگی کی بنا پر روئی ہو۔ اس وقت سے اس پر رسم کا پردہ ڈال دیا گیا تا کہ حقیقت واقعہ کا انکشاف نہ ہونے پائے۔ اب ہمارے لئے کوئی چارہ کار نہیں اور ہم ظاہری اقرار کے پابند ہیں اس لئے عقد پڑھ دیتے ہیں مگر آپ یاد رکھئے کہ اگر لڑکی نے دباؤ سے ''ہوں'' کہی ہو اور واقعی رضامند نہ ہو تو شرعی حیثیت سے وہ نکاح کوئی چیز نہ ہوگا۔

آپ کو اپنی ذمہ داری کا پورے طور پر احساس ہونا چاہئے۔ آپ کو اس کشتی کے ساحل مراد تک پہنچنے کی فکر ہونا چاہئے جسے آپ سمندر میں ڈال رہے ہیں۔ اگر اسی وقت سے لڑکی کے خیالات اپنے آئندہ ہونے والے شوہر کے متعلق خراب ہوں تو کبھی اس کی معاشرت اس کے ساتھ خوشگوار نہ ہوسکے گی۔ آپ کا فرض ہے کہ اس کی زندگی میں

اطمینان وسکون پیدا ہونے کے تمام ذرائع ابھی سے مہیا کریں۔ آپ کو اس میں کوئی برا خیال بھی نہ ہونا چاہئے۔

عزیز داری میں تو اکثر لڑکیوں کو اعزاء کے لڑکوں کے ساتھ بچپنے میں کھیلنے کا موقع حاصل ہو چکا ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ انھیں اسی وقت کسی سے انس اور کسی سے نفرت پیدا ہو چکی ہو۔ کسی اور طرح پر نہیں بلکہ بالکل معصومانہ انس اور نفرت مگر کیا اس وقت جو خیالات پیدا ہو چکے ہیں وہ تبدیل ہو سکتے ہیں؟ اب اگر آپ نے ان کی قسمت کو وابستہ کیا ہے ایسے لڑکے کے ساتھ جس سے انھیں طبعاً تنفر پیدا ہو چکا ہے تو ہرگز ان کی زندگی اس کے بعد خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ بہت سے گھروں کی آبادی اور بربادی کا سوال اس مسئلہ میں مضمر ہے۔

بعض نئی روشنی کے حضرات اور تجدد کے علمبرداروں کا یہ خیال کہ شادی کو محبت پر مبنی ہونا چاہئے یعنی پہلے محبت پیدا کرنے کا موقع دیا جائے پھر شادی کی جائے۔ یہ تو میرے نزدیک ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ محبت ایک اضطراب آفریں تموج ہے اور شادی ایک استوار عمارت۔ کبھی پائدار عمارت متحرک لہر پر قائم نہیں کی جاسکتی اس لئے شادی کی بنیاد تو حکیمانہ دوراندیشی ہی پر مبنی ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے والدین کی رائے زیادہ قابل اعتماد ہے اور ان کا انتخاب زیادہ محفوظ ہے مگر پھر بھی لڑکی کی منشاء کو بالکل نظرانداز کر دینا ہرگز درست نہیں۔ انتخاب کریں والدین ہی مگر لڑکی کی رضامندی صمیم دل سے ضرور حاصل کرلیں۔

اس کے ساتھ عقد میں سادگی اور کفایت شعاری مدنظر رکھیں ہرگز ہرگز اس میں سبکی کا خیال دل میں نہ لائیں۔ خود پیغمبر اسلامؐ سے بڑھ کر کس کی عزت ہوگی۔ اگر آپ

چاہتے تو ہزاروں روپیہ تقریب شادی میں صرف کر دیتے مگر آپؐ نے اپنی صاجزادی سیدۂ عالم کا عقد جس طرح کیا۔ آپ کو معلوم ہے۔ جہیز سیدہ کا کیا تھا؟ لیف خرما کے چند تکیے، چمڑے کا بچھونا، چند مٹی کے برتن، ایک چرخہ اور ایک چکّی۔ آپ سے یہ نہیں کہا جاتا کہ آپ بھی چرخہ اور چکّی دیجیے، مگر آپ بھی اپنے زمانہ کے لحاظ سے ضرورت کی چیزوں پر بقدر حیثیت اکتفا کیجیے۔

سیدۂ عالمؑ اور امیر المومنینؑ کا جو عام طرز زندگی تھا۔ رسالتمآبؐ نے اس کے لحاظ سے کارآمد چیزیں بیٹی اور داماد کو دیں آپ بھی اپنے طرز زندگی کے لحاظ سے کارآمد چیزوں کی ایک فہرست مرتب کر لیجیے۔ مگر اس میں صرف نمائش کا خیال نہ ہونا چاہیے۔

یہ نمائش نہیں تو کیا ہے کہ جہیز کے سامان کو زیادہ دکھلانے کے لئے ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز ایک ایک مزدور کے سر پر رکھ دی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ لڑکی کے ضروریات مدنظر ہیں، نہ داماد کے۔ بلکہ فقط اپنی نمائش مقصود ہے۔

ہم اگر اپنی تمام رسموں میں رسولؐ اور اہلبیت رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں تو ہماری زندگی میں وہ انقلاب ہو جائے جو ہماری آتی ہوئی موت کو پلٹا دے۔ ورنہ سمجھ لیجیے کہ ہم عنقریب حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ کوشش کیجیے کہ ایسا نہ ہو۔

❁❁❁

اسلامی کلچر کیا ہے

لاہور میں بین الاقوامی مجلس مذاکرہ میں اس موضوع پر ایک مقالہ ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کا پیش ہوا جس کی عربی زبان کی کاپی میرے سامنے ہے۔ اس کے ابتدائی سطور حسب ذیل ہیں:

كَانَ الْاِسْلَامُ قَبْلَ كُلِّ شَيْئٍ دِيْنًا اَدّٰى فِيْمَا بَعْدُ اِلٰى نَشُوْ دَوْلَةٍ ثُمَّ حَضَارَةٍ تَكَوَّنَتْ خِلَالَ قُرُوْنٍ طَوِيْلَةٍ وَاَخَذَتْ لَهَا صِبْغَةً خَاصَّةً تَحْتَ تَاْثِيْرِ التَّعَالِيْمِ الْاِسْلَامِيَّةِ وَهٰذَا مَا نُسَمِّيْهِ بِالثَّقَافَةِ الْاِسْلَامِيَّةِ.

(یعنی) اسلام سب سے پہلے تو ایک دین تھا جو بعد میں ایک سلطنت کے پیدا کرنے کا باعث ہوا اور پھر ایک تمدن کا جس کی صدیوں کی طویل مدت میں تشکیل ہوئی اور اس نے تعلیمات اسلامی کے اثر کے ماتحت اپنا ایک خاص رنگ اختیار کیا۔ اسی کو ہم ''اسلامی کلچر'' کہتے ہیں اس میں یہ جو تین درجے قائم کئے گئے ہیں۔

(۱) اسلام سب سے پہلے دین تھا۔

(۲) پھر بعد میں وہ ایک سلطنت کے پیدا کرنے کا باعث ہوا۔

(۳) پھر اس نے ایک تمدن کو پیدا کیا جس کی صدیوں میں تشکیل ہوئی اور تعلیمات اسلامیہ کے ماتحت اس کا ایک خاص رنگ رہا۔ اس کا ہر جز بحث طلب ہے۔

''سب سے پہلے دین تھا'' سوال یہ ہے کہ یہ دین صرف انفرادی زندگی سے متعلق تھا یا اس میں اجتماعی زندگی کے اصول بھی تھے؟ بین الاقوامی روابط بھی تھے اور امن وامان کی ضمانت رکھنے والے ہدایات بھی تھے؟

اگر یہ سب کچھ تھا تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ وہ بعد میں ایک سلطنت کے قیام کا باعث ہوا۔ اگر سلطنت کے تمام مفادات اسی دین کے اندر مضمر تھے تو یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ

اس دین کے قیام کے ساتھ ہی ساتھ ایک حکومت عادلہ کا بھی قیام ہو گیا جس کے سربراہ خود پیغمبر اسلامؐ تھے اور اگر اس دین کا تعلق اجتماعی زندگی سے کچھ نہ تھا بلکہ وہ صرف تعلقات بین الخالق والمخلوق کا کفیل تھا جو مذہب کا مفہوم یورپ کے یہاں ہے کہ وہ انسان کی شخصی زندگی سے متعلق ہے اور یہی مطالبہ روس اور تمام موجود ممالک میں مسلمانوں سے رہا ہے کہ وہ اسلام کو اپنی شخصی زندگی میں محدود رکھیں۔ اگر پروفیسر صاحب کے نزدیک اسلام کی حقیقت بس یہی ہے تو پھر بعد میں جو دولت قائم ہوئی اس کا اسلام کے اصول سے کیا ربط ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دولت مسلمانوں نے قائم کی مگر اسے اسلام کی طرف منسوب کرنے کا کیا مطلب ہے جب کہ اسلام کو دولت کے حدود عمل سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

پھر اس سلطنت کے نتیجہ میں صدیوں کی طویل مدت کے اندر جس تمدن کی بنیاد پڑی اس تمدن کو مطلق طور پر اسلامی تمدن کیونکر کہہ سکتے ہیں اور پھر جب کہ اسلامی تعلیمات نظام اجتماعی سے تعلق ہی نہ رکھتے تھے تو اس تمدن میں جس کی صدیوں کی مدت میں تشکیل ہوئی تعلیمات اسلامی کا اثر کس طرح نمودار ہوا۔

جب کہ وہ تعلیمات عہد رسالت ہی میں مکمل تھے اور اس تمدن نے صدیوں کی طویل مدت میں نشو و نما پائی تو اس تمدن کو آس پاس ممالک کے قومی خصوصیات کا نتیجہ کیوں نہ سمجھا جائے اور اسے اسلام کے سر منڈھ کر "اسلامی کلچر" کے نام سے کیوں موسوم کیا جائے؟

اپنے نقطۂ نظر کی مزید تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے الگ الگ تین منزلیں قائم کی ہیں:

پہلے جماعت اسلامی کا پیدا ہونا۔

دوسرے اسلامی حکومت کا قائم ہونا۔

تیسرے اسلامی تمدن کی پیدائش۔

پہلی منزل میں وہ لکھتے ہیں:

لَقَدْ اَقَامَتْ تَعَالِيْمُ الرَّسُوْلِ جَمَاعَةً مُسْتَقِلَّةً نِظَامُهَا الْخَاصُ فِيْ تَشْرِيْعِهِ وَالْإِدَارَةِ وَالْحُكْمِ وَكَانَ هٰذَا النِّظَامُ قَائِمًا عَلَى التَّعَالِيْمِ الدِّيْنِيَّةِ مُخَالِفًا النِّظَامَ الْعَرَبِ قَبْلَ الْإِسْلَامِ الَّذِيْ كَانَ قَائِمًا عَلٰى اَسَاسِ الْعَصَبِيَّةِ الْقَبِيْلِيَّةِ۔

''پیغمبر اسلام کے تعلیمات نے ایک مستقل جماعت قائم کردی جس کا اپنے قانون اور انتظام اور حکمرانی میں ایک خاص نظام تھا اور یہ نظام دینی تعلیمات پر قائم تھا اور اس طرح عربوں کے قبل اسلام والے اس نظام سے مختلف تھا جو قبائلی تعصب کی بنیاد پر قائم تھا۔''

اس سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ اسلام کوئی ویسا مذہب نہیں جو اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رہے بلکہ اس کا شروع سے خود قانون بھی ہے، ملکی انتظام اور فوجداری کے تعزیرات وغیرہ سب کے اصول اور آئین بھی اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دینی تعلیمات پر قائم ہے۔

پھر جب ایسا ہے تو شروع سے اس کی ایک حکومت اور اس کا خاص ایک کلچر کیوں نہ مانا جائے۔ حکومت ایسی جو اُن حکومتوں سے مختلف ہے کہ جو کسی شخصی یا جماعتی یا قبائلی یا جمہوری اقتدار کی بنا پر قائم ہوتی ہیں اور کلچر بھی ایسا جس میں مادی زیب و زین پیش نظر نہیں ہے بلکہ صلاح و تقویٰ پیش نظر ہے اسی حکومت کو اسلام میں معیار حکومت کے لئے اور اسی کلچر کو اسلامی کلچر سمجھنے کے لئے معیار قرار دینا چاہیے۔

اب اگر مسلمانوں ہی کی حکومت ہو مگر وہ آئین و نظام کے اعتبار سے اس حکومت کے مطابق نہ ہو تو وہ غیر اسلامی حکومت ہے اور اگر مسلمانوں کے عادات و خصائل اور معاشرت میں ایسے اجزاء آجائیں جو اس اولین کلچر سے اصولی طور پر مختلف ہیں تو وہ غیر اسلامی کلچر ہے چاہے اس کے اختیار کرنے والے مسلمان کیوں نہ ہوں۔

دوسری منزل میں ارشاد ہوتا ہے:

مِنْ هٰذِهِ الْجَمَاعَةِ الْمُسْلِمَةِ فِي الْمَدِيْنَةِ نَشَأَتِ الدَّوْلَةُ الْإِسْلَامِيَّةُ وَكَانَ النَّبِيُّ صلعم زَعِيْمُهَا الدِّيْنِيَّ كَمَا كَانَ رَئِيْسَ إِدَارَتِهَا الْمَدَنِيَّةِ وَقَاضِيْهَا

الاکبر الذی یحکم ویفصل فی القضایا والخلافات التی تعرض علیه کما کان بجانب ذلک قائدها الحربی.

(یعنی) اس اسلامی جماعت سے مدینہ میں آکر اسلامی حکومت پیدا ہوئی اور پیغمبرؐ اس کے دینی پیشوا تھے جس طرح اس کے ملکی ادارہ کے سربراہ بھی، اور سب سے بڑے قاضی بھی تھے۔ جو مقدمات اور پیش آمدہ اختلافات کا فیصلہ کرتے تھے جس طرح اس سب کے پہلو بہ پہلو آپ اس کے جنگی قائد بھی تھے۔

جب کہ پہلی منزل میں جب جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی یہ کہا جاچکا ہے کہ لها نظامها الخاص فی تشریعه والادارة والحکم. (یعنی) قانون انتظام ملکی اور فیصلۂ قضایا میں اس کا ایک خاص نظام تھا تو حکومت میں کیا کمی تھی جو مدینہ منورہ میں آکر پوری ہوئی؟ کیا مدینہ میں آنے کے بعد کوئی تاج پوشی ہوئی؟ کیا کوئی تخت نشینی ہوئی؟ کیا رسولؐ نے اپنے لئے نبی اور رسولؐ کے علاوہ ظل اللہ کی قسم کا کوئی لقب اختیار کیا؟ جب یہ کچھ نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مدینہ میں آکر دین نے دولت کی شکل اختیار کرلی؟

اس کے علاوہ اگر یہ مانا جائے کہ مکہ معظمہ میں پیغمبرؐ کی حیثیت صرف نبی اور رسولؐ کی تھی اور مدینہ میں آکر حاکم ورئیس کی حیثیت ہوگئی تو سوال یہ ہے کہ اس حکومت کے لئے آپ کا انتخاب کیا مسلمانوں کے اختیار سے ہوا؟ کیا کوئی مجلس شوریٰ مرتب ہوئی؟ کیا مسلمانوں کا کوئی جلسہ ہوا؟ کیا رائے شماری ہوئی۔

جب یہ کچھ نہیں ہوا اور یقیناً نہیں ہوا تو یہ کیوں نہ مانا جائے کہ نظام اسلام میں حکومت کا منصب قیادت دینی سے الگ کوئی نہیں ہے۔ اس لئے جو خالق کی طرف سے قیادت دینی کے لئے بحیثیت نبیؐ ورسولؐ مقرر کیا گیا تھا وہ اسی کے نتیجہ میں جب دائرہ عمل وسیع ہوا تو حاکم مملکت کی حیثیت سے بھی کارفرما ہوگیا اور قائد جیوش کی حیثیت سے بھی میدان میں آگیا۔

یہی اسلام میں دین ودنیا کے امتزاج کا اصولی تقاضا ہے اور اسی پر اسلام کے دور

اساسی میں عمل ہوا۔

اس کے بعد کبھی اگر مسلمانوں میں دین و دنیا کی تقسیم ہوگئی کہ کوئی مسائل فقہیہ میں مرجع ہو، کوئی قاضی احکام ہو، کوئی حاکم مملکت ہو اور کوئی قائد جیوش، تو ماننا چاہئے کہ یہ تقسیم اسلام کے نظام اساسی کے خلاف ہے۔ جس طرح انتخاب کو عوام کے اجماع یا شوریٰ سے وابستہ کرنا اصول اساسی کے خلاف ہے۔ جس کی بناء پر کسی ایسی حکومت کو جو اس طرح قائم ہو مسلمانوں کی حکومت کہا جاسکتا ہے مگر واقعۃً اسلامی حکومت نہیں سمجھا جاسکتا۔

وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے اس حکومت کے اساسی اصول کو اس آیت میں بیان کیا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا۔ (سورۂ نساء)

مگر سوال یہ ہے کہ کیا رسول کی اطاعت مسلمانوں پر مدینہ ہی میں آکر واجب ہوئی؟ کیا مکہ میں یہ اطاعت واجب نہ تھی؟

یہ اطاعت مطلقہ تو خدا اور رسول کی بمقتضائے دین ہر فرد مومن پر واجب ہے اُسے ملک و سلطنت سے کیا واسطہ؟

پھر جب کہ اللہ کی اطاعت ذاتاً واجب ہے اس میں ہمارے اختیار کو دخل نہیں ہے اور رسولؐ کی اطاعت منجانب اللہ واجب ہے اس میں ہمارے اختیار کو دخل نہیں تو اولی الامر کو کیوں یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کا تقرر ہمارے ہاتھ میں ہے بلکہ یہی سمجھنا چاہئے کہ ان کا تقرر بھی خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہوگا ہمارے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَاحْتَفَظَ الْخُلَفَاءُ بَعْدَ وَفَاةِ النَّبِيِّ بِهٰذِهِ السُّلْطَانِ جَمِيْعِهَا بِاسْتِثْنَاءِ النُّبُوَّةِ.

"رسولؐ کی وفات کے بعد خلفاء نے نبوت کے سوا ان تمام قسم کے اختیارات کو

اپنے لئے محفوظ رکھا۔

لیکن یہ اختیارات پیغمبرؐ کو تو بمقتضائے نبوت حاصل ہوئے تھے پھر وہ خلفاء کی طرف کس طرح منتقل ہوئے؟ اس کے علاوہ یہ بر بنائے واقعہ ہے بھی غلط۔ خلفاء کے دور میں تو امیر مملکت، مفتی شریعت، قاضی احکام اور قائد جیوش کے الگ الگ منصب ہو کر ان اختیارات کو تقسیم کر دیا گیا اور ایک وقت تو شریعت و قضاء کو تابع سیاست دنیا بنا دیا لیکن یہ سب باتیں روح اسلامی کے بالکل خلاف تھیں۔

ممکن ہے انھیں فرقہ وارانہ سوالات قرار دیا جائے لیکن اگر ایسے مشترک کلوکیم میں ایسے اختلافی نقطۂ نظر کا اظہار فرقہ واریت نہیں ہے تو اس پر ایراد کیوں فرقہ واریت سمجھا جائے۔

اور سنیے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''اسلام نے عربوں کو پہلے تو دین کے جھنڈے کے نیچے جمع کیا۔ پھر ان میں ایک سیاسی اتحاد پیدا کیا جس نے ان میں اپنے اوپر اعتماد پیدا کیا اور انھیں آمادہ کیا کہ وہ جزیرۃ العرب کے حدود سے آگے بڑھیں چنانچہ خلیفۂ دوم کے عہد میں انھوں نے شام، فلسطین، مصر، عراق اور ایران فتح کیا۔ پھر اموی خلیفہ ولید کے عہد میں از سر نو حملہ شروع کیا گیا تو اندلس سندھ اور ماوراء النہر فتح کئے''۔

اس عبارت میں دوستی کے پردے میں اسلام کے مخالف اتنے جراثیم ہیں جن کی توقع کسی دشمن ہی سے کی جاسکتی ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام فقط عرب قومیت کو فروغ دینے اور انھیں تمام دنیا پر مسلط کرنے کے لئے آیا تھا اور دین کا نام فقط ان کی تنظیم کا ذریعہ اور انھیں منظّم کر کے فتح ممالک کا ایک بہانہ تھا جو بالکل واقعہ کے خلاف ہے۔

اس نے دین کے جھنڈے کے نیچے فقط عرب کو جمع کیا؟ اور شروع ہی سے سلمان فارسی کو اتنی عزت دے کر جو بہت سے عربوں کو حاصل نہیں تھی۔ کیا عرب اور غیر عرب کو ایک

کرنے کا پیغام نہیں دیا؟ بلال حبشی کو اتنی فوقیت دے کر کیا رنگ کے امتیاز کو ختم نہیں کیا؟ صہیب رومی کو جماعت میں شامل کر کے کیا مشرق و مغرب تک کے فرق کو نہیں مٹایا؟ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اس نے عرب کو دین کے جھنڈے کے نیچے جمع کیا اور پھر ان کی سیاسی تنظیم کر کے ان میں فتح ممالک کا ولولہ پیدا کیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دین اسلام نے تمام عالم انسانی کے لئے ایک متحدہ قومیت کا سنگ بنیاد رکھا تھا جس کے ایک جز کی حیثیت سے عربوں کی بھی تنظیم ہوگئی اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے صالح عناصر جذب ہو ہو کر شریک ہو رہے تھے جس سے پیغمبرؐ اسلام نے اپنی حیات میں ایک مشترک انسانی جامعہ کی تشکیل کر دی تھی جس کے سربراہ وہ خود تھے اور سب بحیثیت ایک زعیم دین کے آپ کی اطاعت کرتے تھے جو اس اطاعت سے بدرجہا زیادہ تھی جو کسی ملک کی رعایا اپنے بادشاہ کی کرتی ہے۔ اس نے سلطنت کے مفادات کو بدرجہ اتم پورا کر کے بادشاہیت اور شہنشاہیت کے تخیلات کو بے ضرورت اور دور از کار بنا دیا تھا۔

اگر یہ دھارا اسی سمت میں بہتا رہتا تو اسلامی فتوحات کا انداز مختلف ہوتا وہ ممالک پر قبضہ نہ کرتا بلکہ اہل ممالک کی تبدیل ماہیت کر کے نہ صرف جغرافیائی خطوط مملکت کو محو کرتا بلکہ درمیان کے قومی، نسلی، اور مملکتی تعصبات کے تخیلی انقسامات کو بھی مٹا دیتا اور ایک وقت عرب و عجم کی تفریق ہی ختم ہو جاتی جس میں فاتح اور مفتوح کا کوئی تصور بھی پیدا نہ ہوتا مگر اسلامی تنظیم میں کچھ عناصر جو روح اسلامی کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر صرف سیاسی وجوہ سے شامل ہو گئے تھے انھوں نے حضرت پیغمبرؐ خدا کے بعد اسلامی تنظیم کا لباس پہنا کر دوسرے اقوام کو مغلوب و مفتوح بنانے کے منصوبے بنا لئے جس نے اسلامی ملک کو مادی حیثیت سے بہت وسیع کیا اور سطحی فوائد عارضی طور پر بہت حاصل کئے مگر اسلام کے حقیقی مفاد اور عالم انسانی میں اس کی فطری مقبولیت کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا جس کی تلافی ناممکن ہے اور دوسرے اقوام کے لئے دین اسلام کے قریب آنے کی راہ میں ایک بڑی ذہنی دیوار حائل کر دی جسے ڈاکٹر

صاحب کے ایسے اسلام کے ناداں دوست اسلام کی غلط ترجمانی سے وقتاً فوقتاً اونچا کرتے رہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:

''اسلام کی چڑھائی ان ملکوں پر تخریبی نہ تھی بلکہ یہ ایک ایسی چڑھائی تھی جو وہاں کے موجودہ تمدن کو باقی رکھنے والی اور اس کے تحفظ اور حمایت پر آمادہ کرنے والی تھی''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام ان کی ہر چیز کو باقی رکھنے کا ذمہ دار تھا تو پھر یہ چڑھائی ہوتی کاہے کے لئے تھی؟

فرض کیجئے وہاں کی تہذیب میں مشرکانہ رسمیں تھیں تو کیا اسلام ان کی حمایت وحفاظت کا بھی کفیل تھا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس چڑھائی سے ان کو کوئی پیغام پہنچانا اور ان کی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا تو پھر کہئے کہ اپنی جوع الارض کو تسلی دینا اور غلبہ واقتدار کی پیاس کو بجھانا تھا۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ

ڈاکٹر صاحب سرخی قائم کرتے ہیں:

اَلثَّقَافَۃُ الْاِسْلَامِیَّۃُ مَزِیْجَۃٌ

یعنی اسلامی کلچر مخلوط شے ہے اور اس کے تحت میں لکھتے ہیں کہ اسلامی کلچر کا خاص امتیاز یہ ہے کہ بہت سی تہذیبوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے تحت میں پھر سرخی ہے کہ ''وہ اجزاء اور موثرات جنھوں نے اسلامی کلچر کی تشکیل کی'' اس میں:

(الف) مختلف اقوام عرب، ایرانی، ترک، بربر، وغیرہ

(ب) مذہبی جماعتیں مسلمان، عیسائی، یہودی، صابئہ، حران۔

(ج) قدیم دنیا کا متروکہ، یونان، فارس اور ہندوستان۔

اسی طرح کیا وہ قول صحیح نہیں ہو جاتا جسے اسی کلوکیم میں ایک مقرر نے پنڈت نہرو کی زبانی نقل کر کے اس کی بڑی سختی کے ساتھ رد کی کہ ''اسلام کا کوئی خاص کلچر نہیں ہے''

ڈاکٹر صاحب نے برائے بیت کہنے کو کہہ دیا ہے کہ

''اس کلچر میں دو چیزوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے:

ایک دین اسلام اور دوسرے عربی زبان۔

چنانچہ عربی نے زیادہ ان زبانوں پر اثر ڈالا جو ممالک اسلامیہ میں مستعمل تھیں جیسے فارسی اور ترکی اور اردو اور سواحلی اور ملادی ان زبانوں نے صرف عربی خط کو قبول نہیں کیا بلکہ بہت سے الفاظ و تعبیرات بھی لئے۔''

مگر اس کے بعد انھوں نے اسلامی کلچر پر ایران کے اثر کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں کہتے ہیں کہ

یہ اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں میں طعام، لباس، موسیقی اور درباری اجتماعات میں نمایاں ہے۔

اول تو یہ بات عالم اسلامی کے تمام نقاط میں کلیۃً درست نہیں ہے مثلاً ہندوستان میں یو. پی. میں بے شک ایران کا اثر نمایاں ہے مگر پنجاب، سندھ، بنگال، مدراس وغیرہ میں طعام و لباس اور دیگر اطراف حیات میں یہ اثر بالکل مفقود ہے بلکہ پنجابی مسلمان اپنے غذا و لباس وغیرہ میں پنجابی ہندو سے اور سندھی مسلمان اپنے غذا و لباس اور رہن سہن کے طریقوں میں سندھی ہنود سے اور بنگالی مسلمان ان باتوں میں بنگالی ہندو سے اور مدراسی مسلمان مدراسی ہندو سے بہت کم مختلف ہیں۔

یو. پی. میں ایرانی اثرات اس لئے زیادہ نمایاں ہیں کہ یہاں کے مسلمان گھرانے عموماً ایران سے ہجرت کر کے آئے ہوئے ہیں اس لئے ان میں جو ایرانی اثرات ہیں وہ ایرانی نسل کے کلچر کی نشانی ہیں۔

جس طرح دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کا جو تمدن ہے وہ ان کے قدیمی نژاد کے اثرات میں سے ہے۔ اسے اسلام سے کیا علاقہ ہے جو اسے ''اسلامی کلچر'' کے اجزاء میں داخل کیا جا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب اس فہرست میں موسیقی کو بھی داخل کیا جارہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی کلچر کی نشان دہی میں آپ کے نزدیک ان حدود وقیود کی بھی ضرورت نہیں ہے جو دین اسلام نے مامورات ومنہیات کے ذریعہ سے عائد کئے ہیں تو پھر اسلامی کلچر کی تشکیل میں دینی گروہوں کے نام کیوں لئے گئے ہیں بلکہ اسی میں مشرکین کو بھی داخل کیجئے جن کے تصورات کی بیخ کنی کے لئے اسلام آیا تھا مگر یہ واقعہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں کی اکثریت میں وہاں کی مشرک جماعتوں کے بھی بہت سے رسم ورواج داخل ہوئے ہیں ہندوستان میں کتنے مسلمان ہیں جو ہولی دیوالی کی رسمیں کرتے ہیں بلکہ یہاں کے بادشاہوں نے بھی ان میں حصہ لیا ہے شادی بیاہ میں کتنی رسمیں ہیں جو ہندوؤں کے یہاں سے ہندوستانی مسلمانوں میں آئی ہیں اور اسی طرح مختلف تقریبات میں کتنی نشانیاں ملکی کلچر کی پائی جاتی ہیں یہ سب چیزیں پھر اسلامی کلچر کے عناصر ترکیبی میں داخل ہوں گی۔

لکھتے ہیں کہ ''ترکوں کے اثرات حربی اور ادارتی پہلوؤں میں نمایاں ہیں اور ان کی شجاعت وبہادری نے اسلام کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے اور ترک خاندانوں نے سقوط بغداد کے عالم اسلامی کے بہت سے اجزاء پر حکومت کی ہے۔

اگر ان باتوں سے اسلامی کلچر میں دخیل ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو پھر انگلستان، فرانس، اٹلی، بلکہ روس کو اسلامی کلچر کے تشکیلی عناصر میں کیوں نہیں درج کیا جاتا اس لئے کہ یہ عالم اسلامی کے بڑے بڑے حصوں پر صدیوں حکومت کر چکے ہیں'' اور اب بھی بہت سے حصوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

یقیناً ان کے محکوم ممالک کے مسلمانوں میں غذا ولباس، معاشرت اور ہر شعبہ زندگی میں ان کے اثرات بالکل نمایاں ہیں۔

اور سنیئے ارشاد ہوتا ہے:

اَمَّا الْبَرْبَرُ فَقَدْ قَضَى الْعَرَبُ حَوَالَىْ خَمْسِيْنَ عَامًا لِاِخْضَاعِهِمْ

وَكَسْبِ صَدَاقَتِهِمْ وَبِمُسَاعَدَتِهِمْ اِسْتَطَاعَ الْعَرَبُ فَتْحَ الْاَنْدَلُسِ.

رہ گئے بربری تو واقعہ یہ ہے کہ عربوں کو ان کے دبانے اوران کی دوستی حاصل کرنے میں تقریباً پچاس برس لگے اوران ہی کی مدد سے عرب اندلس کو فتح کر سکے۔

تواس سے کیا ہوا؟ اسلامی کلچر میں ان کا حصہ ہوگیا۔

ثرات العالم القدیم کے تحت میں ارشاد ہوتا ہے کہ عربوں نے نہ صرف قیصر وکسریٰ اور خاقان کے ممالک کو حاصل کیا بلکہ ایران وفارس اور ہندوستان کا فلسفہ اور وہاں کے علوم بھی لئے اوراس سب سے عالم اسلامی میں نئی نئی عقلی اور تہذیبی تحریکیں اٹھیں جیسے معتزلہ کی تحریک"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام خود اپنا نہ کوئی فلسفہ رکھتا ہے نہ اس کا خود کوئی عقلی سرمایہ ہے یہ سب اس کے پاس اموال غنیمت میں آیا ہے جسے اس نے مقبوضہ زمینوں کی طرح ہضم کرلیا ہے کیا اسلام کا کوئی دشمن اس کے سوا کچھ کہہ سکتا ہے پھر یہ کہ تاریخی طور پر بھی یوں غلط ہے کہ یونان وغیرہ کے فلسفے عربی میں زمانہ بنی عباس میں منتقل ہوئے ہیں اور معتزلہ کی تحریک اس کے پہلے موجود تھی۔

خاتمہ پر ہمارے پاکستانی ڈاکٹر صاحب نے بھارت کو بھی عزت بخش دی ہے کہ ہندوستان سے عربوں کے فلکیات اور طب اور ریاضت اور ہندسے لئے جو غلطی سے یورپ میں عربی ہندسے مشہور ہیں حالانکہ وہ درحقیقت ہندوستان سے ماخوذ ہیں۔

پورے مقالے کو ختم کرنے کے بعد حضرت دکتور نے یہ دو سطریں لکھی ہیں کہ:

"کلچر کے ان تمام مخلوط اجزاء کے ہوتے ہوئے۔

لَهَا خَصَائِصُهَا الَّتِي تُمَيِّزُهَا عَنْ غَيْرِهَا مِنَ الثَّقَافَاتِ وَالْحَضَارَاتِ.

پھر بھی اسلامی کلچر کے کچھ خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے کلچروں اور تمدنوں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔

لیجئے مقالہ ختم ہو گیا حالانکہ معقولات کا مشہور مسلمہ ہے کہ:

شَيئِيَّةُ الشَّیءِ بِصُوْرَتِهٖ لَا بِمَادَّتِهٖ.

ایک شے کی اصل حقیقت اس کی امتیازی صورت سے وابستہ ہے نہ کہ اس کے مادے سے کہ جس میں عموماً اشتراک ہوتا ہے۔

اس لئے اسلامی کلچر پر جو تقریر ہو اس میں انہی امتیازی خصوصیات کا بیان ہونا چاہئے جو اسے دوسرے کلچروں سے ممتاز کرتے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے پورا مقالہ صرف کر دیا یا مادی اجزاء کے بیان میں اور جب امتیازات کے بیان کا وقت آیا تو خاموشی۔

بات یہ ہے کہ جو افراد اسلامی کلچر سے خود اپنی ذاتی زندگی میں وابستہ ہی نہیں ہیں وہ جب اسلامی کلچر پر تقریر کی زحمت فرمائیں تو اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے۔

صحیح نقطۂ نظر

جسے میں نے اس مذاکرہ کی تقریباً آخری تاریخ برکت علی ہال کی اپنی تقریر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا یہ ہے کہ عموماً جتنے کلچر ہیں سب مختلف اقوام و ممالک میں ملکی و نسلی رجحانات کے ماتحت قائم ہوئے ہیں۔ اسلامی تعلیمات چونکہ ہر شعبہ پر حاوی ہیں لہٰذا اس کے ہدایات ان تمام شعبوں میں حلال و حرام کے قیود عائد کرتے ہیں لہٰذا کسی ملک یا قوم کے کلچر میں جہاں تک جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی پابندی کی جائے وہ کلچر اس ملک یا قوم کے خصوصیات کا حامل رہتے ہوئے بھی اسلامی کلچر ہوگا اور جب ان قیود کی پابندی نہ کی جائے تو وہ چاہے خالص عربی کلچر ہو مگر وہ غیر اسلامی ہو جائے گا۔

اس طرح اسلام کا کلچر تمام اقوام و ممالک کے کلچر کا مدمقابل نہیں ہے بلکہ ان سب کو ایک صالح سانچہ میں ڈھالنے کا ذمہ دار ہے۔ والسلام

❁❁❁

آیۃ اللہ العظمیٰ سرکار سید العلماء
سید علی نقی نقوی طاب ثراہ